کیا ہے، جو مقابلہ میں سب سے بہتر غزل کہنے والے کو دیا جائے گا، اس کتابچہ میں ان حضرات کی غزلوں کے منتخب اشعار شائع کیے ہیں، جو مقابلہ کی شرطوں کے مطابق اور اس طرح آں راکہ گرمیٔ ایماں حیات نیست" میں کہی گئی تھیں، اس انتخاب میں یو۔پی، بہار، بمبئی، حیدرآباد، دہلی اور پنجاب کے اہل سخن و اصحاب ذوق کا کلام شامل ہے، چند ہندو اور خواتین شعرا بھی اس بزم سخن میں شریک ہیں، فارسی شعر و سخن کا مذاق عام کرنے کی یہ کوشش لایق تحسین ہے،

رنگ برنگے پھول مرتبین جناب شہباز حسین و نند کشور صاحبان، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت

بچوں کی نظمیں) و طباعت عمدہ، صفحات ۹۶ مجلد، قیمت دس رو پیے پبلیکیشنز ڈویژن

پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔

بچوں کے بین الاقوامی سال کے موقع پر مختلف زبانوں میں ان کے لیے کتابیں بھی شایع کی گئی تھیں، پبلیکیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند نے اس موقع پر بچوں کے لیے رنگ برنگ اردو نظموں کا یہ مجموعہ شایع کیا ہے، اردو کے بعض اہل قلم اور شاعر صرف بچوں ہی کے لیے نظمیں اور کتابیں لکھتے تھے جیسے اسمٰعیل میرٹھی، حامد اللہ افسر میرٹھی، شفیع الدین نیر وغیرہ اس مجموعہ میں ان کے علاوہ نظیر اکبر آبادی، پنڈت دیاشنکر نسیم، حالی، چکبست، اقبال، تلوک چند محروم، جوش ملیانی اور بہت سے موجود شعرا کی نظمیں اکٹھا کی گئی ہے، مجموعہ کی ابتدا حمد و مناجات کی نظموں سے ہوئی ہے، پھر ہندوستان کی عظمت پہاڑوں، دریاؤں، موسموں، قدرتی مناظر، جانوروں، پرندوں، ہندو مسلم تہواروں اور بعض نئی ایجادات پر نظمیں ہیں، بعض نظمیں اخلاقی بھی ہیں، امید ہے بچے نظموں کے اس دلچسپ اور سبق آموز مجموعہ کو شوق سے پڑھیں گے

"ض"

جلد ۱۲۸ ماہ ذی قعدہ ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۸۱ء عدد ۳

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

انگریزی زبان کے مشہور ڈرامہ نگار برنارڈ شا ڈرامائی انداز میں بیان دے کر ساری دنیا کو چونکا دیتے تھے، اُن ہی کا بیان ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب پورا یورپ مشرف بہ اسلام ہو جائے گا،

یہ بیان عجیب غریب ضرور ہے مگر عیسائی مدبرین، مبلغین اور مستشرقین کو غیر شعوری طور پر احساس ہے کہ اسلام میں جو نفوذ کی قوت ہے اس بنا پر کہیں یہ واقعی ہر جگہ چھا نہ جائے، اس لئے وہ کبھی مسلمانوں کے خلاف جنگی محاذ آرائی کرتے ہیں، کبھی مذہبی علمی اور تحقیقی تحریریں لکھ کر اسلام کے خلاف زہر پھیلاتے ہیں، اُن کے یہاں خوشی منائی گئی کہ انھوں نے صقلیہ اور اندلس کے مسلمانوں کو یورپ سے جلا وطن کیا، وہ اس لئے بھی مسرور ہیں کہ دولت عثمانیہ کی جلالت و عظمت کو اپنے حیلۂ افرنگی سے ختم کر ڈالا، ان کو اس سے بھی تسکین ہوئی کہ ہندوستان کی مغلیہ سلطنت پھر ایران، مشرقِ وسطیٰ اور مصر کی حکومتوں کو برباد کر کے وہاں کے مسلمانوں کو اپنا غلام بنا لیا، گو وہ اب پھر سے آزاد ہو چکے ہیں، ان زیادتیوں کے باوجود اُن کو یہ بھی احساس ہے کہ اسلام دنیا میں جس طرح بڑھتا گیا، اس کو وہ روک نہ سکے، عیسائیوں کی آبادی اگر نو سو پچاس ملین ہے تو مسلمان دنیا میں سات سو پچاس ملین ہیں، گو عیسائیت ساڑھے چھ سو برس اسلام سے پرانی ہے، مسلمانوں کی آبادی عیسائیوں سے کم ضرور ہے مگر خود اُن کا اعتراف ہے، کہ اسلام عیسائیت کی طرح ایک فرقہ کے اندر محض ایک چرچ نہیں بلکہ یہ ایک ایسی کمیونٹی ہے جو مذہب سے منسلک ہے اور یہی اس کی مخصوص قوت ہے،

عیسائی مبلغین کی باضابطہ متمول تنظیمیں ہیں، جو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں، مسلمانوں کی ایسی تنظیمیں نہیں ہیں، پھر بھی دنیا کے ہر گوشہ سے غیر مسلموں کے مشرف با اسلام ہونے کی خبریں برابر ملتی رہتی ہیں، اس صدی میں سائنس کا عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ امریکہ کے خلاباز چاند کی سطح پر اترے، مگر مذہب کی تاریخ میں بھی یہ ایک عظیم واقعہ ہے، کہ اس کے ایک خلاباز جیمس ایروِن نے چاند کی سطح پر سے اس دنیا کو دیکھا تو اس کو یہ کائنات کے ایک معمولی مادہ کے سوا کچھ نظر نہیں آئی جس کے بعد اس کو اللہ کا قائل ہونا پڑا، اسی کے ساتھ اس کو احساس ہوا کہ اللہ کا آخری پیام اسلام ہی قبول کرنے کے لائق ہے، جب وہ زمین پر اترا، تو اس نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا، اس کا یہ اعلان کسی تلوار کے ڈر یا پیٹرو ڈالر کے لالچ میں نہیں ہوا،

اسلام کے خلاف عیسائی مبلغین اور مستشرقین ہر قسم کی زہر چکانی اور ہرزہ سرائی کرتے رہے ہیں، مگر حقیقت دبنے کے بجائے ابھر کر سامنے آہی جاتی ہے، گبن نے اپنی مشہور تاریخ ہسٹری آف دی ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر میں لکھا تھا، کہ افریقہ اور ایشیا کے لاکھوں انسان مومن عربوں کی صف میں کسی دباؤ کے بغیر شامل ہوتے رہے، وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف اپنی رغبت مائل ہوتے ہوئے، وہ کلمہ پڑھ لیتے، ختنہ کرا لیتے تو چاہے قیدی ہوں یا غلام یا مجرم، وہ یہ محسوس کرنے لگتے کہ وہ آزاد ہو کر فاتح مسلمانوں کے برابر ہو گئے ہیں، اب وہ گنہگار نہیں سمجھے جائیں گے، وہ اپنی اندرونی صلاحیت اور ہمت کو بیدار پانے لگے، اسی طرح عرب کے پیغمبرؐ نے جو روحانی اور دنیاوی تعلیمات دیں اُن کی طرف بے شمار لوگوں کو ترغیب ہونے لگی، نو مسلموں کو عرب کے پیغمبرؐ کے الہامات کی سچائی اور پاکیزگی پر یقین ہونے لگا، مشرک بھی ان الہامات کو انسانی عقل اور ربانی تخیل کے مطابق سمجھنے لگے، اسلام کا پیام زرتشتیوں کے پیام سے زیادہ خالص اور موسیٰؑ کے افکار سے زیادہ فیاض تھا، اس میں وہ متضاد باتیں بھی نہ تھیں جن کی تعلیم انجیل کے ذریعہ سے ساتویں صدی میں دی جا رہی تھی، (جلد سوم ص ۵۹)

ایچ۔ جی۔ ویلس نے اپنی کتاب دی آؤٹ لائنز آف ہسٹری میں اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بہت کچھ لکھا ہے، اس کا قلم رسول اللہ صلعم کی شان میں بہت گستاخ ضرور ہو گیا ہے، لیکن وہ اس کا اعتراف کرتا ہے کہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام میں بہت سی عمدہ اور اعلیٰ تعلیمات ہیں، جب اس کی تبلیغ شروع ہوئی تو معاشرہ میں ظلم و ستم کا دور دورہ تھا،

جس سے سوسائٹی دب کر رہ گئی تھی، اسلام نے ایک ایسا معاشرتی نظام پیش کیا جس سے معاشرتی ستم آرائی ختم ہوگئی، اسلام کے معاشرہ میں لطف، مہر، اور محبت ہے یہی ایک تنہا خصوصیت نہیں، بلکہ قرآن کے ذریعہ سے اس نے توحید کا جو تخیل پیش کیا، وہ یہودیوں سے بالکل مختلف تھا، عیسائیت نے اس تخیل کو اتنا گنجلک بنا دیا ہے کہ اس سے نہ صرف تفرقہ پیدا ہوتا گیا، بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کی اسپرٹ ہی جاتی رہی، اسلام میں عبادت کرنے کا جو نظام ہے، وہ بھی اس کی قوت ہے، پھر اس میں مکہ کو جو اہمیت دی گئی ہے، اس سے بھی اس کی شان میں اضافہ ہوا، یہ نیا مذہب وہی ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی زندگی میں عیسائیت یا گوتم بدھ کی زندگی میں بودھ ازم میں تھا، اسلام میں بڑے بڑے علماء، فضلاء، اساتذہ اور مبلغین ہوئے لیکن اُن میں پادری نہیں ہوئے،

ایچ جی۔ ویلس کی اس تحریر میں یہ بھی ہے کہ اسلام میں لطف و کرم، فیاضی اور اخوت کی تعلیم بھری ہوئی ہے، یہ بہت ہی سادہ اور قابل فہم مذہب ہے، اس کو معمولی آدمی بھی آسانی سے سمجھ لیتا ہے، یہودیت کے یہاں خدا عجیب غریب چیز بن گیا ہے، عیسائیت میں تثلیث، عقائد اور کفر کی اتنی پیچیدگیاں ہیں کہ ایک معمولی آدمی کو اُن کے اور چھور کا پتہ نہیں چلتا، مزدکیت کا اعلیٰ تخیل مانی کو دار پر چڑھانے میں ختم ہوگیا، دنیا جب غیر یقینی حالت میں تھی، مکاری عام تھی، تفرقہ پھیلا ہوا تھا، اخوت کا فقدان تھا، بہشت راہبوں، پادریوں، اور اُن کے ہمنوا حکمرانوں کے لئے مخصوص تھی تو محمدؐ نے ایسی تعلیم دی جو لوگوں کے دلوں میں اتر گئی،

ایچ۔ جی۔ ویلس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسلام پھیلتا گیا، یوان چوانگ تک پہونچا، افریقہ تک گیا، اس کے سیلاب میں ایرانی، رومی، یہودی، اور مصری تمدن بہہ گیا، اس کو اس لئے فروغ ہوا کہ اس کے ذریعہ سے اس زمانہ کے لئے بہترین معاشرتی، و سیاسی نظام پیش کیا گیا، یہ اس لئے بھی پھیلا کہ لوگ سیاسی حیثیت سے مظلوم تھے، ان کا استحصال ہو رہا تھا، اُن کے اوپر

خود غرض حکومت قائم تھی، اسلام میں وسیع النظری تھی، اس کی تعلیمات میں تازگی تھی، پاکیزگی تھی، اس کے سیاسی نظریوں میں نیا پن تھا، اس زمانہ کے سیاسی اور معاشرتی نظام کے مقابلہ میں اس کا نظام ہر طرح بہتر تھا، اس لئے رومن امپائر کے سرمایہ دارانہ نظام اور یورپ کی معاشرتی روایات پر اس سے بڑی ضرب کاری لگی، ایچ۔ جی۔ ویلس یہ بھی لکھتا ہے کہ مسلمانوں میں زوال اس وقت شروع ہوا، جب انھوں نے اپنے اس اخلاص کو زائل کر دیا، جس سے انسانیت متاثر ہوئی تھی، (ص ۵۷۹، ۵۸۱-۵۸۹ سنہ ۱۹۲۹ء اڈیشن)

اس کا یہ لکھنا صحیح ہے، چنانچہ خود مسلمان اسلام کی اشاعت میں رکاوٹ بن گئے حضرت بایزید بسطامیؒ کے زمانے میں ایک یہودی ان کا بہت معتقد ہوگیا جب مسلمانوں نے اس سے کہا کہ وہ اسلام قبول کرلے، تو اس نے جواب دیا کہ اگر مسلمانی وہی ہے جس پر بایزید عمل کرتے ہیں تو وہ بہت اونچی چیز ہے، میں اس پر عمل نہیں کر سکتا، اور اگر مسلمانی وہ ہے، جس پر تم عمل کرتے ہو تو اس سے مجھ کو شرم آتی ہے، اسی طرح ایک امریکن کی یہ بات مشہور ہے کہ جب وہ اسلام کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ فوراً مسلمان ہو جائے، لیکن جب وہ مسلمانوں کی زندگی کو دیکھتا ہے تو پھر اسلام کے قبول کرنے سے باز رہتا ہے،

حضرت عمر فاروق اعظمؓ جب بیت المقدس میں داخل ہوئے تو اُن کی سادگی، خشیت الٰہی، ایمان پروری اور انسان دوستی دیکھ کر وہاں کے عیسائی متاثر ہو کر بول اٹھے کہ مسلمان عیش و عشرت کے لئے جد و جہد نہیں کرتے، بلکہ نوع انسان کو سنوارنے، اور صفحۂ دہر سے باطل کو مٹانے کے لئے کوشاں ہیں، حضرت عمرؓ نے اپنے ارشاد اور احتساب سے اپنے والیوں، فوجی سرداروں اور لشکریوں کو پاکیزہ نفسی، اسد اللّٰہی، اور دیانت داری کی اسلامی تعلیم دے کر اُن کو اسلام کی ایسی سچی تصویر بنا دی تھی کہ ان کو دیکھ کر غیر مسلم اسلام کی طرف خود بخود کھنچتے تھے، اسی لئے اُن کے زمانے

میں جتنے علاقے فتح ہوئے، وہاں کے باشندے بطیب خاطر سب کے سب مسلمان ہو گئے،

موجودہ دور کی انسانیت اسی کرب و اذیت میں مبتلا ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانہ میں تھی، اس کی نظر خدا کے آخری پیام انسانیت کی طرف اٹھ رہی ہے، اگر مسلمان زبان، دل اور عمل کی سچائی، دیانت داری، عدل پروری، اخوت، عفو و درگزر، انسان دوستی، حلم، بردباری، رفق، لطف، خوش کلامی، میانہ روی، خودداری، خودشناسی، حق گوئی اور بے باکی کی اسی تعلیم پر عمل کرنے لگیں، جو اسلام نے دی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ دکھ بھری انسانیت اسلام کو دنیا کے لئے صحیح معنوں میں رحمت اور برکت سمجھنے کے لئے مجبور نہ ہو، مسلمانوں کو اس وقت اپنے عمل اور زبان حال سے یہ کہنا ہے :-

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے

یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنوں

طلوع ہے صفت آفتاب اس کا غروب

یگانہ اور مثال زمانہ گونا گوں

نہ اس میں عصر رواں کی حیا سے بے زاری

نہ اس میں عہد کہن کے فسانہ و افسوں

حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی

یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسم افلاطوں

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوق جمال

عجم کا حسن طبیعت، عرب کا سوز دروں

مقالات

حکیم سنائی کے قصائد اور اسلامی افکار و عقائد

از
پروفیسر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

فارسی شاعروں میں حکیم سنائی غزنوی کو بعض حیثیتوں سے تقریباً سبھوں پر تفوق حاصل ہے، وہ بڑی اہم سیرت شخصیت کے مالک تھے، وہ نہایت بے باکی اور جرأت سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے، بادشاہ وقت ہوں یا وزیر مملکت، ہر ایک کے سامنے حق کا اظہار بے جھجک کرتے، علماء کی سخت گیری سے نالاں ہوئے تو بہرام شاہ غزنوی کے نام ایک خط لکھا، اس میں اپنے نقطۂ نظر کو جس انداز میں پیش کیا ہے، وہ انہی کا حصہ ہے، خط کے آخری جملے یہ ہیں :

از سید کائنات محمد مصطفٰے صلوات اللہ علیہ	جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے
اخبار صحیح مروی است و سلف صالحین	صحیح حدیث مروی ہے، اور سلف صالحین
برآں اند و مناقب آل رسول صلوات اللہ علیہ	اسی کے تبع رہے اگر آل رسول صلوات اللہ علیہ
و مثالب آل سفیان اگر دروغ است و	کی تعریف و توصیف اور آل سفیان کی برائیاں
کافۃ الناس نہ بریں ہستند عقلاً دانند کہ چنیں	غلط ہیں اور عامۃ الناس کا یہ دستور نہیں تو
است و کلمۃ الحق است، لا کلام فیہ۔	نہ ہو، دانشمند جانتے ہیں کہ بات ایسی ہی ہے
	یہی کلمۂ حق ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں۔

بار خدایا آراستہ گرداں عالم را با عالمانی
کہ از تو بترسند یا از خلق شرم دارند و ما را ابتلائے
صحبت بیگانگاں کوئے تربیت نگرداں و سلطان
عصر را توفیق دہ کہ مفسداں را نانواختہ
دارد کہ در نواختن ایشاں ہلاکت دین است
و توفیق دہ تا مصلحان و حلال خوارگان را
نیکو دارد کہ در نیکو داشت مصلحاں نظام
دین و دولت است و بقائے مملکت
(مکاتیب سنائی طبع ۱۹۶۲
ص ۱۲۰ - ۱۲۱)

بار خدایا! عالم کو ایسے عالموں سے آراستہ
کر جو تجھ سے ڈرتے یا مخلوق سے شرم رکھتے ہیں،
اور ہمیں کوچۂ علم و عرفان سے بیگانہ لوگوں کی
صحبت سے محفوظ رکھ اور بادشاہِ وقت کو توفیق
دے کہ وہ مفسدوں کو نہ نوازے، اس لیے کہ
ان کی نوازش میں دین کی ہلاکت ہے، اور اسے
ایسی توفیق عنایت کرے کہ وہ نیک اور پاکیزہ
لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے، اس لیے کہ
ان کے ساتھ خوش سلوکی نظام دین و دولت
اور بقائے مملکت کا ضامن ہے۔

ابوالقاسم درگزینی سلطان سنجر کا وزیر تھا، اس نے حکیم سنائی کو اپنے دربار میں مدعو کیا، لیکن وہ وزیر کی سخت گیری سے بیزار تھے، انھوں نے دعوت نامہ رد کر دیا، اس سلسلہ میں ان کے دو خط اور دو قطعے موجود ہیں جو ایک طرف ادبی شاہکار ہیں، اور دوسری طرف حق گوئی اور بے باکی کے ایسے نمونے ہیں جن کی مثال آج کے دور جمہوری میں بھی نہیں ملتی، نمونے کے لیے چند جملے نقل کیے جاتے ہیں:

اکنوں بہ بزرگی کہ زد بفضل الکبیر با آں بزرگ
دین و دنیا کردہ در خور است کہ گوشہ دار ایں
گوشہ گرفتہ را بتقاضا آسایش خود خراب نکند
کہ جسم حقیر ایں بندہ نہ سزائے چشم قریر آں
خداوند است و ایں بیتے چند برائے ایں بحث

آپ کی اس بزرگی کا واسطہ جو خدائے بزرگ
و برتر کی طرف سے عنایت ہوئی ہے، کہ اس
گوشہ گیر کے سکون دل کو اپنے یہاں کے آرام و
آسایش کی دعوت سے برباد نہ کریں، اس لیے
کہ میرا حقیر جسم آپ کی آسودہ چشمی کی تاب نہیں

ارشاد و انشا کرد:
ای چو عقل از کل موجودات فرد
وی جواں از تو سپہر سال خورد
خاک بوسانِ سر کوئے تو اند
روشنان کارگاہِ لاجورد
پاسبان در و بام تو اند
چرخ و خورشید و مہ گیتی نورد
تا سنائی کیست کاید بر درت
مجد کو؟ تا گویدش اندر راہ برد
گرتن و جانم بخدمت نامدند
عذر شاں بپذیر کہ مستمکش نبرد
صدر تو چرخ است و تن را بال نیست
روئے تو مہر است و جاں را چشم داد
جان من آزاد کن تا عقل من
ہر زماں گوید: زہ اے آزاد مرد

لا سکتا، یہ چند ابیات فی البدیہہ نظم ہو گئے ہیں:
اے وزیر! تو عقل کی طرح سارے عالم میں
ممتاز و منفرد ہے، تیری توجہ سے سپہر پیر جواں سال
ہو گیا ہے، سارے ستارے اور سیارے
آپ کے آستان کے خاکبوس ہیں، اور آسمان،
سورج، چاند جس کے در کے پاسبان ہیں، اس کے
دربار میں سنائی کے آنے کا کیا موقع، اگر سنائی
جان و تن سے حاضر دربار نہ ہو سکا تو اس کا
عذر قبول کر، اس میں حیلہ و حجت کی کوئی بات
نہیں، تیری بارگاہ آسمان کی طرح بلند ہے،
اور میرے بازو کمزور ہیں، تیرا چہرہ آفتاب کی
مانند درخشاں اور میری جان کو گویا آشوب چشم
ہے، مجھے میرے حال پر چھوڑ دے، اس کے لیے
میں تیرا ثنا خواں رہوں گا۔
(مکاتیب سنائی ص ۱۰۴)

سنائی کی سیرت کا اہم پہلو ان کے کلام میں پوری طرح نمایاں ہے، ان کے کلام کا دوسرا مابہ الامتیاز وصف یہ ہے کہ انھوں نے جس طرح اور جس انداز میں اسلامی فکر کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے اس کی مثال فارسی شاعری میں مفقود ہے، دین کو ان کی فکر میں سب سے زیادہ اہم مقام حاصل تھا، اسلام کا جیسا درد ان کو تھا، اس کے لیے ان کے رقعات سے دو ایک مثالیں پیش کرتا ہوں:

اگر چگونہ بہ بدعت آں کس را نسبت کنند کہ اگر
در تجرۂ حروف نقش دو نگرید جمال سنت آنجا
بیند، و اگر از نقش نقوش نثرش بجوید توحید
و تجرید آنجا یابد
(مکاتیب ص ۶۲)

تو پھر ایسے شخص پر بدعت کا الزام کیسے لگ سکتا
ہے کہ اگر اس کے منظومات کے حروف کے حجرے
میں دیکھیں تو جمال سنت وہاں دیکھیں اور اگر
اس کے نثر کے نقوش کا مطالعہ کریں تو توحید
و تجرید وہاں پائیں۔

در مزرعۂ دین ہر تخم کہ اندازی برومند
است و در شاہراہ شرع اگر چہ گامیست
سودمند است۔ (مکاتیب ص ۹۶)

دین کے کھیت میں جو تخم بویا جائے گا اس میں
پھل آئے گا اور شرع کی شاہراہ میں جو قدم
اٹھایا جائے گا سودمند ہوگا۔

سنائی کی مثنویات کے تمام تر موضوعات دینی، اخلاقی اور عارفانہ ہیں، ان کی شہرۂ آفاق مثنوی حدیقۃ الحقیقہ ہے، اس مثنوی کو تصوف کی دنیا میں جو شہرت حاصل ہوئی وہ محتاج بیان نہیں، سنائی کے تصوف کی بنیاد دین پر ہے، اس کا ثبوت حدیقہ کے موضوعات اور فہرست عناوین سے بخوبی فراہم ہوتا ہے، فارسی میں تصوف و اخلاق کے لیے عام طور پر صنف مثنوی مخصوص تھی، چنانچہ فارسی مثنویات کا وافر حصہ تصوف و اخلاق سے گہرا ربط رکھتا ہے لیکن سنائی کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے دینی و اخلاقی و عرفانی مطالب کے لیے صنف قصیدہ سے بھی کام لیا، انھوں نے قصائد میں دلچسپ مضامین کے دریا بہائے ہیں، حکیم کے اکثر قصائد بلاشبہہ دینی و عرفانی خیالات کے قابل یادگار نمونے ہیں، جن کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قصیدہ نگاری محض لغو خیالات کا مجموعہ اور بیکاری کا مشغلہ ہی نہ تھا، اس کے ذریعہ مفید کام انجام پا چکے ہیں۔

سنائی کے متعدد قصیدے اخلاقی و عرفانی رنگ میں ہیں، عام اخلاقی قصائد کے علاوہ ان کے مخاطب علماء، مشائخ، صدور و قضاۃ ہیں، ان کی نسبت سے دینی اور علمی غور و فکر کا اظہار ان مدحیہ قصائد میں ہوا ہے، ان میں بادشاہوں اور امراء کا ذکر بہت کم ہے، چند ہی بادشاہوں اور امیروں کے

نام کے قصائد ان کے دیوان میں پائے جاتے ہیں اور ان میں بھی مبالغہ اور لفاظی کے بجائے اخلاق و عرفان کے موضوعات پر اظہار خیال ہوا ہے، اور ان کے کلام میں اس قسم کے منظومات کی کثرت کی وجہ سے ان کے قصائد کی ایک نوع "الزہدیات" قرار پائی ہے، جو دیوان کے بعض قدیم نسخوں میں موجود ہے، اور اس نوع کے ذیل میں سارے اخلاقی و دینی رنگ کے قصیدے جمع ہو گئے ہیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عرفانی و اخلاقی قصائد کے لحاظ سے فارسی شاعروں میں سنائی منفرد ہیں اور بجز دو شاعروں یعنی ناصر خسرو اور سعدی کے کسی اور کا نام ان کے ساتھ نہیں لیا جا سکتا، لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ ناصر خسرو ایک اسماعیلی مبلغ و داعی ہے، اس کے یہاں اخلاقی موضوعات ہیں، مگر عرفان اور تصوف سے اس کا تعلق نہ تھا، سعدی کے اخلاق پر سنائی کی طرح دینی اور فکری رنگ غالب نہ تھا، گویا ان دونوں شاعروں سے بھی سنائی منفرد ہیں۔

حکیم سنائی نے قصیدوں میں دین کو جس طرح پیش کیا ہے اس سے ان کا شمار بڑے درجے کے اسلامی مفکرین میں ہونا چاہیے، ان کی اسلامی فکر کی حیثیت محض نظری نہ تھی، ان کی شاعری میں بڑا پیغام ملتا ہے، چونکہ ان کے مخاطب عوام و خواص سبھی قسم کے لوگ تھے، اس لیے ان کے یہاں تعریف، تنقید، طنز اور اعتراض سب کچھ ملتا ہے، انھوں نے اسلامی معاشرے پر جو دین کی گرفت سے آزاد ہو رہا تھا سخت تنقید کی ہے، انھوں نے کرب و درد کے ساتھ بار بار یہ تذکرہ کیا ہے کہ معاشرہ علم و عمل سے خالی ہو رہا ہے، اخلاقی کمزوری ہر طبقے کے لوگوں میں تیزی سے راہ پا رہی تھی، اظہار حق میں کوئی جھجک نہیں محسوس کرتے، اس لیے سوسائٹی کے ہر طبقے کے افراد کی خوبیوں اور خامیوں کی پوری تشخیص کی ہے اسباب و عوامل کے ذکر کے ساتھ خرابیوں کے دور کرنے کی صورتوں کی طرف بھی اشارے کیے ہیں، وہ علمائے سو کے بڑے مخالفین میں تھے، ظاہرداری ان کے نزدیک زبردست اخلاقی فساد کا نتیجہ ہے علماء و فقہاء کے بگاڑ کو وہ دین کا بگاڑ سمجھتے تھے، اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان کے دور میں جن معاشرتی

داخلاقی کوتاہیوں کا ذکر ملتا ہے، وہ آج کی بات معلوم ہوتی ہے، اور واقعی بات ہے کہ آج سے نو سو سال قبل دینی اور اخلاقی لحاظ سے معاشرہ جس طرح بگڑ چکا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان نو سو برسوں میں بگاڑ کی رفتار بہت تیز نہ تھی، ورنہ اب تک سوسائٹی دینی اور اخلاقی لحاظ سے انسانیت کی منزل سے گذر گئی ہوتی۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ سنائی کی شاعری کا یہ عملی پہلو اگرچہ قصائد میں بہت نمایاں ہے، مگر ان کی شاعری کے دیگر اصناف میں بھی یہ رخ پوری طرح روشن ہے، اور ان کی نثری تحریر جو خطوط کی شکل میں باقی ہے، ان کی سیرت کے اس پہلو کی سب سے بڑی آئینہ دار ہے۔

دین کو انسانی زندگی میں سب سے اہم مقام حاصل ہے، مگر اس دور کے معاشرہ میں اسے جس مقام کا حامل ہونا چاہیے وہ نہیں، اس کا انھیں سخت ملال تھا۔ شاید ہی کوئی قصیدہ ہو جس میں اس کا ذکر کسی نہ کسی عنوان سے نہ آگیا ہو، اس سلسلہ کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

ایک قصیدہ کے چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں، واضح ہو کہ سارے قصیدے کا شروع سے آخر تک ایک ہی انداز ہے، اس میں کوئی شعر مدحیہ نہیں:

عالمے پر لشکر دیو است و سلطانِ تو دیں — زآں سلطان باش و مندیش از بروت لشکری
دیں حسین ِ تست آنرو آز و خوک و سگ است — تشنہ ایں را می کشی و آں ہر دو را می پروری
بر یزید و شمر ملعون چوں ہمیں لعنت کنی — چوں حسینِ خویش را شمر و یزید دیگری
گرد جعفر گرد گرد دیں جعفری جوئی ھمی — زانکہ نہ بود ہر دو ہم دینار و درہم دیں جعفری
چوں تو داودی دیں را بنیاد دیں کے کند — پنج حس و ہفت اعضاء مرترا فرماں بری
اختر نیکوت باید بر سپہر دیں برائے — زانکہ اندر دور او طالع بود نیک اختری
چوں تو "لا" را کہتری کردی پس از دیوان عمر — جز تو "الا اللہ" کہ خواہد یافت امر مہتری

چوں در خیبر بجز حیدر نہ کند از بعد آں — خانۂ دیں را کہ داند کرد جز حیدر دری
عقل و دین و ملک و دولت پایداری روزگار — کے دہد ہر خوک و خر را رہ بقصر قیصری
اندریں رہ صد ہزار ابلیس آدم روئے ہست — تا ہر آدم روئے را زنہار آدم نشمری
غول را از خضر نشناسی ہمی در تیہ جہل — زاں ہمی از رہبراں جوئی ہمیشہ رہبری
برتر اے از طبع و نفس و عقل ابراہیم دار — تا بدانی نقشہائے ایزدی از آزری
از دو چشم راست بیں ہر گز نخیزد گبر و شرک — شرک مرد از احولی داں گبر مرد از اعوری
گرچہ در اللہ اکبر گفتنی تا با خودی — بندۂ کبری نہ بیشدہ پادشاہِ اکبری
آفتاب دیں برون از گنبد نیلوفری است — چہ بر آر از ذاد و دانش ہوکہ زبیرون پری

(دیوان تصحیح مدرس رضوی چاپ ابن سینا ص ۴۴۴-۶۵۶)

ایک دوسرے قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر چہ بینی جز ہوا آں دین بود بر جاں نشاں — ہر چہ یابی جز خدا آں بت بود در ہم شکن
سر بر آر از گلشن تحقیق تا در کوے دیں — کشتگانِ زندہ بینی انجمن در انجمن
در دیں خود بو العجب دردیست کاندر وے چو شمع — چوں سوئے بیمار خوشتر گردی از گردن زدن
بار نامۂ ما و من در عالم حس است و بس — چوں ازیں عالم بروں رفتی نہ ما ماند نہ من
از بروں پردہ بینی یک جہاں پر شاہ و بت — چوں درون پردہ رفتی ایں رہے گشت آں شمن
پوشش از دیں ساز تا باقی بمانی بہر آنک — گر بریں پوشش نمیری ہم تو گوری ہم کفن
باد قبلہ در رہِ توحید نتواں رفت راست — یا رضائے دوست باید یا ہوائے خویشتن

(دیوان، ص ۴۸۵)

ایک تیسرے قصیدے کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں جن سے دین کی اہمیت اور خود دین کے

انقلابی تصور سے کماحقہ آگاہی ہوتی ہے:

زماہ دیں تواں آمد بصحرائے نیاز اولی
بمعنی کے رسد مردم گذر ناکردہ بر اسما

درون جوہر صفرا ہمہ کفرات و شیطانی
گرت سودائے دیں باشد قدم بیروں نہ از صفرا

چہ مانی بہر مرداری چو زاغاں اندریں پستی
قفس بشکن چو طاؤساں یکے بر پر بریں بالا

عروس حضرت قرآں نقاب آنگہ براندازد
کہ دارالملک ایماں را مجرد بیند از غوغا

عجب نبود گر از قرآں نصیبی نیست جز نقشے
کہ از خورشید جز گرمی نہ بیند چشم نابینا

اگر دینت ہمی باید ز دنیا دار دل بگسل
کہ حرصش با تو ہر ساعت بود بے حرف بے آوا

ہمی گوید کہ دنیا را بدیں از دیو بخریدم
اگر دنیا ہمی خواہی بدہ دین و ببر دنیا

ز باد نقد و باد فقر دیں را ہیچ نکشاید
میاں در بند کاری را کہ ایں زنگت دہن آدا

چہ علم آموختی از حرص آنگہ ترس کاندر شب
چو دزدی با چراغ آید گزیدہ تر برد کالا

ازیں مشتی ریاست جوی رعنا ہیچ نکشاید
مسلمانی ز سلماں جوی و درد دین ز بو دردا

دگر نز بہر دہ مشتی حد اندر بند دی گردوں
دگر نز بہر شرعستی کمر بکشادی جوزا

چوں تن جاں ساختن کن بعلم دیں کہ زشت آید
درون سو شاہ عریاں و بیروں سو کوشک و دنیا

ترا یزداں ہمی گوید کہ در دنیا مخور بادہ
ترا ترسا ہمی گوید کہ در صفرا مخور حلوا

ز بہر دیں بنگذاری حرام از حرمت یزداں
ولیک از بہر تن مالی حلال از گفتۂ ترسا

(دیوان ص ۵۱ بعد)

اس قبیل کے اشعار سے جو سنائی کے کلام میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، واضح ہے کہ دین انسانی زندگی کا سب سے زیادہ موثر عامل ہے، ان کے یہاں دین کا ایک وسیع تصور ملتا ہے، وہ ایک حرکی عنصر ہے، لیکن ان کا یہ انقلابی تصور عام نہیں ہو سکا ہے اس لیے کہ سنائی کے افکار پر

کچھ نہیں لکھا گیا ہے، اگر ان کے کلام بالخصوص قصائد کا صحیح طور پر مطالعہ ہوا ہوتا تو وہ اقبال کے محبوب ترین شاعر قرار پاتے، اس لیے کہ ہمیں ان دونوں شاعروں کے یہاں بڑی فکری مماثلت ملتی ہے۔

حکیم سنائی یونانی فلسفے کے مخالفین میں تھے اور اس کو توحید اسلامی کی راہ میں رکاوٹ خیال کرتے تھے، ان کے زمانہ میں مسلمانوں میں یہ فلسفہ رواج پا رہا تھا اور ایک گروہ دانشمندوں میں ایسا تھا جو اس کی حمایت میں کوشاں تھا، حکیم سنائی اس گروہ سے نبرد آزما رہے ہیں، دہریت بھی پھیل رہی تھی سنائی اس کی مخالفت میں بڑا زور صرف کر رہے تھے، چنانچہ ایک پورا طویل منظومہ اسی موضوع پر سپرد قلم کیا ہے، یونانی فلسفے کے رد میں کافی اشعار پائے جاتے ہیں، ذیل میں دو قصیدوں سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں، ان سے سنائی کے موقف کی پوری نشاندہی ہو جائے گی:

الا از چنبر اسلام بردہ سر بیروں
ز سنت کردہ دل خالی ز بدعت کردہ سر مشحون

ہوا ہموارہ شیطانی شدہ بر نفس تو سلطان
تنت را جہل پیرایہ دلت را کفر پیرامون

اگر در اعتقادی من بشکی تا بہ نظم آرم
علی رغم تو در توحید فصلی گوش دار اکنون

الا آنکس کہ عالم را طبائع مایہ پنداری
نہی علت ہیولی را کہ آں ایدون و ایں ایدون

ہیولی چیست اندر است فاعل ویں بداں ماند
کہ در نخ با بر گاو است و آمد نالہ از گردون

ترا پرسید دشمن خواہم ز سر بیضۂ مرغی
چہ گفتست اندر معنی تمام محققین کن افلاطون

سپید و زرد و دو بینم دو آب اندر یکے بیضہ
وزاں یک بیضہ چندیں گونہ مرغ آید ہمی بیروں

نگوئی از چہ معنی گشت پر زاغ چوں قطراں
ز بہر چہ دم طاؤس رنگیں شد چو بوقلموں

ہما و چغد را آخر چہ علت بود در خلقت
چہ باشد آنچناں مشئوم و چوں تو ایں چنیں میموں

تفکر کن یکے در خلقتِ شاہین و دم غابی
نگوئی کز چہ معنی راست آں سقطان و ایں سقطن

یکے چوں رایت سیمیں ہمیشہ در ہوا بازاں
یکے چوں زورقِ زریں رواں ہموارہ در جیحون

چه او ریک زمین چندیں نباتِ مختلف بینم
ز نخل و نار و سیب و بید چوں آبی و چوں زیتون

همی دوں می خورند یک آب و در یک بوستاں رویند
به رنگ و نیل صبر و سنبل و مازو و مازریون

اگر علت طبایع شد وجود جمله را چوں شد
یکے ممسک یکے مسهل یکے دارو یکے طاعون

همانا اینکه من گفتم طبایع کرد نتوانند
نه افلاطوں، نه غیر او به زرق و حیلت و افسون

مگر بیچوں خداوندی که اهل هر دو عالم را
بقدرت در وجود آمد و بے آلت بکاف و نون

خداوندے که آدم را و فرزندانِ آدم را
پدید آورد از ماءِ معین و از گلِ مسنون

همیشه بود او بے ما همیشه باشد او بیشک
صفاتش همچو ذاتش حق و لیکن سرِّ او مخزون

که پنهاں کرد جز ایزد بسنگ خاره در آتش
که رویاند همی جز وی ز خاکِ تیره آذریون

صدف حیراں بدریا در غزالِ آهو بصحرا در
دمیده وادمیده هر دو در دریا و در هامون

(دیوان ص ۵۳۶ ببعد)

ایک اور قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مسلماناں مسلماناں مسلمانی مسلمانی
ازیں آئین بے دیناں پشیمانی پشیمانی

مسلمانی کنوں اسمیست بر عرفے و عاداتے
دریغا کو مسلمانی، دریغا کو مسلمانی

فرو شد آفتابِ دیں برآمد روزِ بے دیناں
کجا شد درد بو دردا و آں اسلامِ سلمانی

جہاں یکسر همه پر دیو و پر غول اند امت را
که یارد کرد جز اسلام و جز سنت نگهبانی

بمیرید از چنیں جائے کزو کفر و هوا خیزد
ازیرا در چناں جا نها فرو ناید مسلمانی

شراب و حکمتِ شرعی خورید اندر حریم دیں
که محروم اند ازیں عشرت هوس گویانِ یونانی

مسازید از برائے نام و دام و کام چوں غولاں
جمالِ نقشِ آدم را نقاب نفسِ شیطانی

شود روشن دل و جاں تاں ز شرع و سنتِ احمد
ازاں کز علت اولیٰ قوی شد جوهر ثانی

تو اے مرد سخن پیشه که بهر دام مشتی دوں
ز دینِ حق بماندستی به نیروے سخن دانی

پسِ مستی دیدی از سنت که رفتی سوئے بے دیناں
چه تقصیر آمد از قرآں که گشتی گرد لامانی

بروں کن طوقِ عقلانی بسوئے ذوقِ ایماں شو
چه باشد حکمتِ یوناں به پیشِ ذوقِ ایمانی

(دیوان ص ۶۷۸ - ۶۸۰)

ایک پورے قصیدے میں حضرت امام ابوحنیفہ کا ایک دہری سے مناظرہ نقل کیا ہے "قصیدہ" کا عنوان یہ ہے: در بطلانِ حجت دہریان و برہان بر اثباتِ ذاتِ خداوند سبحان فرماید

قصیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بار خلیفہ کے دربار میں ایک دہری آیا، اس نے کہا کہ شریعت کی پابندی فضول ہے، کھاؤ پیو، مزے اڑاؤ، دنیا خود قدیم ہے، اس کا کوئی خالق نہیں، مادہ اور ہیولیٰ یہ دنیا کا مادہ ہے، امیر المؤمنین نے حضرت امام ابوحنیفہ کو طلب کیا، قاصد گیا اور صورت حال سے مطلع کیا، حضرت ابوحنیفہ مغرب تک نہ آئے، دہری کو بہت غصہ آیا، اور کہنا شروع کیا کہ وہ مجھ سے مناظرہ نہیں کر سکتے، مارے خوف کے وہ نہیں آ رہے ہیں، اتنے میں امام صاحب رونما ہو گئے اور تاخیر سے آنے کی اس طرح توجیہ کی کہ دربار میں آنے کی غرض سے جب میں دجلہ کے کنارے پہونچا تو کشتی جا چکی تھی، وہاں ایک درخت تھا، اس کے تختے ہو گئے، پھر وہ مل گئے اور ایک کشتی بن گئی، آہنی حلقے خود بخود ظاہر ہو کر کشتی میں ٹھنک گئے اور پھر کشتی کنارے آ گئی اور اس میں سوار ہو کر میں نے دجلہ پار کیا، اس بنا پر میں دیر سے پہونچا، دہری نے یہ باتیں سنیں اور بول اٹھا کہ اس سے بڑا جھوٹ اور کچھ نہیں ہو سکتا، امام نے جواب دیا کہ دہری کا عقیدہ ہے کہ عالم قدیم ہے، اس کا کوئی خالق نہیں، خود بخود ہیولیٰ سے وجود میں آ گیا ہے، اگر اس کا یہ قول صداقت پر مبنی ہے تو پھر درخت کا خود بخود تختہ بن جانا، تختوں کا خود بخود جڑ جانا، حلقوں کا پیدا ہو کر کشتی میں ٹھنک جانا کیونکر ممکن نہیں ہو سکتا، اس کے بعد خداوند عالم کی مخلوقات اور صنائع و بدائع کا ذکر کر کے خالقِ کائنات کے وجود پر ایک مدلل تقریر کی، دہری کے اپنا

کوئی دلیل سوائے خاموشی کے نہ تھی، اور اپنی اس گستاخی کے نتیجے میں وہ سولی پر چڑھا دیا گیا۔

ذیل میں اس قصیدے کے چند اشعار پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے سنائی کے احساسات کا اندازہ ہو سکے گا اور یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ وہ امام ابو حنیفہؒ کو کس مرتبے کا امام سمجھتے تھے:

اے خردمند موحد پاک دیں ہوشیار ــــ از امام دین حق یک حجت از من گوش دار

آں امامے کو ز حجت بیخ بدعت را بکند ــــ نخل دیں در بوستان علم زو آمد ببار

آنکہ در پیش صحابہ فضل او گفتہ رسولؐ ــــ تا قیامت داد علمش کار خلقاں را استوار

شمع جنت خواند عمرؓ را نبی یکبار و بس ــــ بوحنیفہ را چراغ امتاں گفت او سہ بار

چوں پدید آمد بکوفہ بوحنیفہ تاج دیں ــــ آنکہ شد از علم او دین محمدؐ آشکار

گفت گر دو امتم ہفتاد و سہ فرقت بہم ــــ ہست یک زاں اہل جنت را مرجح دیگر بنار

بوحنیفہ سرور آں قوم اہل جنت است ــــ ہمچو دیں ہوئی از وے شود مقہور و خوار

معنی سرپا گفتن بوحنیفہ را چراغ ــــ ماضی و مستقبل و حال از علومش ند چار

آنکہ رفت و بیگاہ آید وانکہ بیند روے او ــــ ہر سہ را زو روشنائی ہر سہ را علمش حصار

دہریے آمد بنزدیک خلیفہ ناگہاں ــــ بغض دینی منقضی شوخی پلید نابکار

ایں چہ بند است از شریعت بر تنت گفتا اے پیر ــــ یا فقیہی پادشاہی خوش خور و بے غم گذار

روزہ و عقد و نکاح و دور بودن از مراد ــــ حج و غزو و عمرہ وایں امرہائے بیشمار

خویشتن رنجہ چہ داری چوں بعالم ننگری ــــ تا بدانی کایں قدیم است و ندارد کردگار

گفت رسم شرع و سنت جملہ تزویر و ریاست ــــ سر بسر گیتی قدیم است و ندارد کردگار

طبع و خیش و ہیولی را شناسم اصل کون ــــ ہر کہ ایں منکر آید عقل او دارد غبار

گفت امیر المومنیں کاسر دو پر دعوی باش ــــ تا بیاید آں امام راستین فخر دیار

گفت از خجلت کہ اے نعمان چرا دیر آمدی ــــ داد نعمانش جوابے پر معانی حرد وار

گفت حالی چوں شنیدم امر شہ برخاستم ــــ رخ نہادم سوئے قصر و تخت شاہ تاجدار

چوں رسیدم برکران دجلہ کشتی رفتہ بود ــــ بود نخلی منکر آنجا تختہ ہا شد بر قطار

درہم آمد کشتی شد در زمانش ناپدید ــــ خود بخود بشکست آنجا بر کنار رودبار

حلقہ ہائے آہنی دیدم ز سنگ آمد بروں ــــ اندر آمد در جوار و کشتی شد پایدار

کشتی آنگہ پیش آمد من نشستم اندرو ــــ زیں سبب تاخیرم آمد اے پسر حذردار

گفت ملحد شرم دار اے بوحنیفہ زیں دروغ ــــ تختہ آورد کایں کس ندارد استوار

اس کے بعد صانع عالم کو ثابت کیا ہے خصوصاً آدمی کی پیدائش کا ذکر کرکے صانع عالم کی کمال خلاقی کو بتایا ہے، پھر کہتے ہیں:

صانعے باید حکیم و قادر و قائم بذات ــــ تا پدید آید ز صنع او بہستان قندھار

طبع ناداں کے پدید آرد حکیم و فیلسوف ــــ عقل از تو کے پذیرد ایں سخن را برمدار

رد بگو ایزد یکے قائم بذات و لم یزل ــــ قادر و معطی و دانا خالق بر و بحار

ما نبودیم او پدید آورد مان از چار طبع ــــ محدث آمد چار طبع و چار فصل روزگار

(دیوان ص ۲۳۸ بعد)

سنائی بڑے درجہ کے موحد تھے، ان کا کلام توحید کے اعلیٰ خیالات سے مملو ہے، ان کے نزدیک کائنات کا سارا عمل ذات باری کے حکم کے تابع ہے، وہ ذات واجب الوجود ہے، اس کا کوئی شریک رکھتا نہیں، وہ بے عیب ہے، ہر ضرورت سے مبرا، اوپر جو اشعار نقل ہوئے ہیں ان میں سے بعض میں توحید باری تعالیٰ سے متعلق خیالات کا اظہار ہوا ہے، دیوان میں متعدد قصائد ہیں جن کا موضوع ہی توحید خداوندی ہے، چند منظومات سے منتخب اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

اے در دلِ مشتاقاں از عشق تو بستانہا — وز حجت بے چونی در صنع تو برہانہا

در ذات لطیفِ تو حیراں شدہ فکرتہا — بر علم قدیمِ تو پیدا شدہ پنہانہا

در بحر کمالِ تو ناقص شدہ کاملہا — در علیّنا قبولِ تو کامل شدہ ناقصہا

در سینۂ ہر معنی بفروختہ آتشہا — بر دیدۂ ہر دعویٰ بر دوختہ پیکانہا

از سوز جگر چشمے چوں حقّہ گوہرہا — وز آتشِ دل آہے چوں رشتۂ مرجانہا

(دیوان ص ۱۶)

شہادت گفتن آں باشد کہ ہم ز اول در آشامی — ہمہ دریائے ہستی را بداں حرف نہنگ آسا

نیابی خار و خاشاکے دریں رہ چوں بفراشی — کمر بست و بفرق استاد در حرف شہادت لا

چو لا از حد انسانی فگندت در رہِ حیرت — پس از نور الوہیت باللہ آی از الّا

آنکہ نام او مکاں آمد ندارد خود مکاں — پس تو دارندۂ مکانی در مکاں چوں خوانمت

ایں و آں باشد اشارت سوئے اجسام کثیف — تو لطیفی در عبارت ایں و آں چوں خوانمت

آنچہ دل داند حدوث است آنچہ لب گوید حدوث — من ز دل چوں دانمت یا از زباں چوں خوانمت

از دعائے کن زکاں آمد پس از تخییل خویش — در مناجات از فضولی کن زکاں چوں خوانمت

(ص ۱۰۴-۱۰۵)

بندۂ ناصحِ ملک باش کہ با داغ ملک — روزہا ایمنی از شحنہ و شبہا ز عسس

ہر کہ او نام کسے یافت ازیں درگہ یافت — اے برادر کسے او باش و میندیش ز کس

(ص ۳۰۷)

با دو قبلہ در رہِ توحید نتواں رفت راہ — یا رضائے دوست باید یا ہوائے خویشتن

(ص ۴۰۸)

نبوت کے بارے میں حکیم سنائی کے وہی خیالات ہیں جو سلف صالحین سے چلے آرہے ہیں، محمد رسول اللہ صلعم کے عقیدے کا تقاضا ہے کہ مسلمان اپنی مرضی کو سنت رسولؐ کے تابع کر دے، اس لیے کہ اچھے اور برے کا مدار اس پر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس امر خاص میں کیا عمل رہا ہے، جو ان کو پسند ہے وہ چیز اچھی ہے، جو ان کو ناپسند ہے وہی چیز بری ہے، سنائی نے سنت رسولؐ کی اتباع کو دین و ایمان بتایا ہے، ان کے اس طرح کے خیالات سے دیوان بھرا پڑا ہے، اس سلسلے کے چند منظومات کا اقتباس درج کیا جاتا ہے:-

نبودی دین اگر اقبال مرد مصطفائی را — نکردی ہرگزی پیدا خدائے اخدائی را

رسولِ مرسل تازی کہ بہ نزد باوی از کوششش — ہمیں گنج زمینی را ہماں گنج سمائی را

(دیوان ص ۳۳)

چوں بصحرا شد جمال سید کون از عدم — جاہ کسریٰ را ز دو بعالمہائے عزل اندر قدم

کوس دعوت چوں بزد در خاک بطحا در زماں — بر کنار عرش بر زد رایتِ ایمان علم

آفتاب کل مخلوقات آنکہ از بہر جاہ — یاد کرد ایزد بجانِ او بعصراں در قسم

بر سرِ چرخ گردوں نام او بینی نشاں — بر نہاد عرش یزداں نام او بینی رقم

رایتِ نَصرٌ مِّنَ اللہ چوں برآمد از عرب — آتش اندر زد بجان شہہ ایوانِ عجم

چرخ اعظم آمدہ پیش قیامش در رکوع — خادم کسریٰ از دو کسرو ز جاہ او نجم

تا بیان شرع دو فنش را خدا اندر جہاں — یاد کرد اندر کلام خود نہ افزوں و نہ کم

صادقین بوبکرؓ بود و قانتین فرخ عمرؓ — منفقین عثمانؓ، علیؓ مستغفرین آمد بہم

بہتر اولاد آدم خواجہ ہر دو جہاں — آنکہ یزداں نقش امامت داد و بر کل امم

از جلال و جاہ و اقبالش خدائے ذوالجلال — نام او پیش از ازل با نام خود کردہ رقم

مرد و ہر دو جہاں و کار ساز حشر و نشر — آفتاب دین محمد سید عالی همم

در سخن جز نام او گفتن خطا باشد خطا — در ہنر جز نعت او گفتن ستم باشد ستم

(ص ۳۶۳ مجلد)

اے سنائی گر ہمی جوئی ز لطف حق سنا — عقل را قربان کن اندر بارگاہ مصطفیٰ

مصطفیٰ اندر جہاں آنگہ کسے گوید کہ عقل — آفتاب اندر فلک آنگہ کسے جوید سہا

طوق داران الٰہی از زبان ذوق و شوق — عقل را در شرع او خوانند غم خوار و کیا

در شریعت ذوق دینی یابی نہ اندر عقل از آنک — قشر عالم عقل دارد مغز روح انبیا

عقل تا با خود منی دارد عقالش خواں نہ عقل — چوں منی زو دور گشت آنگہ ورا خوانش ندا

عقل کاکو دست او را شرع نپذیرید دغ — باز چونکہ گشتہ گم در شرع پیشش کہربا

در خدائے آباد یابی امر و نہی و دین و کفر — و احمد مرسل خدائے آباد را بس پادشا

رحمۃ للعالمین آمد طبیبت زو طلب — چہ ازیں عاصی و زاں عاصی ہمی جوئی شفا

کاں شفا کز عقل و نفس و جسم و جاں جوئی شفا — چوں نہ از دستور او باشد شفا گردد شفا

کاں نجات و کاں شفا کارباب سنت جستہ اند — بوعلی سینا ندارد در نجات و در شفا

مسجد حاجت روا جوئی مجو اینجا کہ نیست — راہ سنت گیر و آنگہ مسجد حاجت روا

چنگ در فتراک او زن تا بہ حق یابی رہی — سنگ بر قندیل خود زن تا ز خود گردی رہا

در حریم مصطفیٰ بوبکر دار اندر حشم — تا سیہ روئی جفا بینی ز خوش خوئی وفا

عشق را بینی علم بر کردہ اندر کوئے صدق — عقل را بینی قلم بشکستہ در صدر رضا

بادفا وران دین چنداں بپر در راہ او — تا نہ بال خوف ماند با تو نہ پر رجا

(ص ۴۳-۴۴)

حسب ذیل نعتیہ قصیدے میں سورۂ والضحیٰ کی پوری تفسیر فی البدیہہ کی گئی ہے، چند ابتدائی شعر نقل کیے جاتے ہیں:

کفر و ایماں را ہم اندر تیرگی ہم در صفا — نیست دار الملک جز رخسار و زلف مصطفیٰ

موے و روئش گر بصحرا نادیدی قہر و لطف — کافری بے برگ ماندستی و ایماں بے نوا

نسخہ جبر و قدر در شکل روے و موے اوست — ایں ز "واللیل" شو معلوم آں از "والضحیٰ"

گر نسیم کفر و ایماں نیستی آں زلف و رخ — کی قسم گفتی بداں زلف و بداں رخ پادشا

(دیوان ص ۳۴)

ایک نعتیہ قصیدے کے چند شعر قابل ذکر ہیں:

مرحبا اے رایت تحقیق رایت را حشم — رائے تو باشد حشم توفیق بفرماند علم

گر نبودی بود تو موجود کلی را وجود — حق بجائے تو نکردی یاد در قرآں قسم

گر نخواندی رحمۃ للعالمین یزداں ترا — در ہمہ عالم کہ دانستی صمد را از صنم

چو لعمرک گفت اینجا جائے دیگر والضحیٰ — گشت تاں روشن کہ تو ابو القاسمی نہ بو الحکم

تا نسیم روے و موئیت پردہ از رخ بر نداشت — نہ ظلم از نور پیدا بود نہ نور از ظلم

عالمی بیمار غفلت بود اندر راہ لا — حق ترا از حقہ تحقیق فرمودش نعم

کاے محمد رو طبیب حاذق و صادق توئی — خلق کن با خلق و برنہ درد ایشاں را مرہم

(دیوان ص ۴۴، ۳۷)

اصحاب رسول اللہ کو دین کا صحیح ترجمان سمجھتے تھے، اپنے زمانے کے مسلمانوں کے دینی انحطاط کا ان کو بہت احساس تھا، ایک طرف تو علمائے سو کا غلبہ تھا، دوسری طرف باطل عقائد ابھر رہے تھے، لوگ یونانی فلسفہ کی پیروی میں دین و شریعت کی نئی تعبیر پیش کرتے تھے، سنائی کو اس کا بڑا درد تھا،

اور انھوں نے متعدد نظموں میں اس فتنے سے آگاہ کیا ہے، ایک قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

راہِ دیں پیداست لیکن صادقِ دیندار کو ۱؎ — یک جہاں معشوق بینم، عاشقِ غمخوار کو

عالمی پر ز دو انکار است از خمارِ خواجگی — اے دریغا در جہاں یک حیدرِ رضؓ کرار کو

گشت پُر طوفاں زنا اہلاں زمانہ چوں کنم — آں دعائے نوح و آں کشتیِ دریا بار کو

طور ہست و لن ترانی لیک چوں موسیٰؑ ترا — آں تجلائے جلال و وعدۂ دیدار کو

پیش ازیں در راہِ دیں بُد صد ہزار اسفندیار — گرد ہفت اقلیم اکنوں یک سپہ سالار کو

عمرؓ و عثمانؓ و بوبکرؓ و علیؓ بینم ہمی — آں حیا و حلم و عدل و صدق آں ہر چار کو

در رہِ ھل من مزید عاشق ہر جانت را — آں انا الحق گفتن و آں دجلہ و آں دار کو

ہمو رچ از معشوق در بع از عاشقاں خالی بماند — در دیار دردمنداں یک در و دیوار کو

چشمِ موسیٰؑ تار شد بر طور غیرت ز انتظار — جلوۂ توحید و برقِ خرمنِ اشرار کو

گیرمت بوبکرؓ نامت چوں نداری صدقِ اوؓ — یارِ دنداں مار و زخم آں درِ غار کو

چوں ہمی خواہی کہ عماری بوسے بر ساقِ عرش — در رہِ اسلام عشق بوذرؓ و عمارؓ کو

(دیوان ص ۲۴۳ ، ۲۴۲)

ایک دوسرے قصیدے میں دین کے دعویداروں کی خوب خبر لی ہے چند شعر ملاحظہ ہوں:

اے سنائی چند لاف از خواجہ و مہتر زنی — دار قلابان ہمی بے مہر سلطان زر زنی

با بجوز دلا بجوز اندر مشو در کوئے عشق — رخت دل در خانہ نہ تاکے چو درباں در زنی

گر یکے دم بر تو افتد باز پرس از یاد فقہ — قال قیلے پیش گیری چنگ در دستر زنی

۱؎ اسی زمین میں ایک اور قصیدہ اور مشابہ زمین میں دوسرا قصیدہ ہے جن میں اسی مضمون کو پیرایہ اظہار خیال ہوا ہے، دونوں کے مطلع [illegible]

ہر یکے دعوی است مرد امر و معنی دار کو — تیز بینی پاک دستی رہبر غمخوار کو (ص ۲۴۲)

اے سنائی عاشقی را درد باید درد کو — بار حکم نیکواں را مرد باید مرد کو (ص ۵۴۷)

باز اگر در صدر نقہت مفتیِ لازم کند — نقد را منکر شوی با شیخ شبلیؒ بر زنی

امر قال اللہ اگر دانی صلیب از کف بنہ — تا کے از عیسیٰ گراں جوئی و لاف از خر زنی

جامہ مومن، سینہ کافر رسم تر سایاں بود — روے چوں بوذر نمائی راہ چوں آزر زنی

ایں ہمہ رنگست و نیرنگست زلیخی سر بتاب — عاشقی شو تا مغنی چنگ در دلبر زنی

اے سنائی راست می گوئی ز کج گویاں مترس — تا قدم چوں دم براہِ دینِ پیغمبر زنی

(۶۹۴-۶۹۳)

حسب ذیل قصیدے میں "اصحاب قال" کی نکوہش کی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بس کنید آخر محال اے حملگی اصحاب حال — در مکان آتش زنید اے طائفۂ ارباب قال

زینہار و زینہار از گرم رفتن دم زنید — زیں بجز و لا بجوز و خرقہ و حال و مجال

خرقہ پوشہ گشتہ اند از بہر زرق و مخرقہ — دیں فروشاں گشتہ اند از آرزوئے جاہ و مال

اے نظام الدین و فخرِ ملت و شیخ الشیوخ — چند ازیں حال محال و چند ازیں ہجر و وصال

کے تواں مرد ذوالجلال و ذوالبقا را یافتن — در خط خوب تکین و در خم زلفِ سینال

مرد آں باشد کہ متواری شود سیمرغ وار — ہشت جنت زیر پر و ہفت دوزخ زیر بال

اے جنیدؒ و بایزیدؒ از خاک سر بر کنید — تا جہاں نے پُر جدل بیند و خلقے پُر جدال

اے دریغا صادقان گرم رو در راہِ دیں — نیر ایشاں دیدہ دوزد و عشق ایشاں سینہ مال

کے خبر داری تو اے نامحرم نا اہل حام — از جفاہائے صہیبؓ و از بلا ہائے بلالؓ

عالمے زاغ سیاہ و نیست یک باز سفید — یک رمہ افراسیاب و نیست پیدا پور زال

صف دیواں بینم اینک در مصارف جبرئیل — بیشہ شیراں شرزہ شد کمیں گاہ شگال

(ص ۳۴۵ بعد)

(باقی)

امام ابو معشر سندی صاحب المغازیؒ

از

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

صدر اسلام میں ہندوستان کے جن غلاموں اور ان کے خانوادوں نے اپنے علمی و دینی کارناموں کے باعث امامت و سیادت پائی اور صدیوں تک ان کے علم و فضل کی گرم بازاری رہی، ان میں امام ابو معشر نجیح بن عبد الرحمٰن سندی مدنی صاحب المغازی متوفی ۱۷۰ھ رحمۃ اللہ علیہ کو خاص مقام و مرتبہ حاصل ہے۔

انھوں نے مرکز اسلام مدینہ منورہ میں ہوش کی آنکھ کھولی، بعض اصاغر صحابہؓ کی دید و زیارت کا شرف پایا، علمائے تابعین سے علم حاصل کیا، زندگی کا بیشتر حصہ یہیں بسر کیا، اور سیر و مغازی میں ایک اہم کتاب لکھی، جو بعد میں مدینہ منورہ کی دیگر کتبِ مغازی کی طرح اس موضوع کا مستند ماخذ قرار پائی، زندگی کے آخری دور میں خلیفہ مہدی عباسی کی دعوت پر بغداد آئے اور دس سال کے بعد یہیں انتقال کیا، دوسری اور تیسری صدی کے علمائے اسلام کی طرح وہ بھی حدیث و فقہ کے زبردست علماء اور حفاظِ حدیث میں سے تھے، اسی کے ساتھ اخبار و احداث خصوصاً سیر و مغازی میں امامت کا درجہ رکھتے تھے[1]۔

امام ابو معشر کے تذکرہ نویسوں نے ان کے حالات زندگی کے بارے میں نہایت اختصار سے

---

[1] ابو معشر سندی مدنی کے معاصرین میں ایک اور صاحب علم ابو معشر کی کنیت سے مشہور تھے، جو بنی مالک بن زید مناۃ ابن تمیم سے تھے، ان کا نام زیاد ابن کلیب تھا، یوسف بن عمر کی امارت عراق کے زمانہ میں فوت ہوئے (معارف)

کام لیا ہے، ابن سعد متوفی ۲۳۰ھ نے طبقات میں، خلیفہ بن خیاط متوفی ۲۴۰ھ نے تاریخ میں، ابن قتیبہ متوفی ۲۷۶ھ نے المعارف، امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ نے تاریخ کبیر، امام ابن ابی حاتم رازی متوفی ۳۲۷ھ نے کتاب الجرح والتعدیل، ابن ندیم موجود ۳۷۷ھ نے الفہرست اور ابو الفضل محمد بن طاہر ابن القیسرانی متوفی ۵۰۷ھ نے الانساب المتفقہ میں، امام ابو معشر کے متعلق چند سطریں لکھی ہیں، ان میں سے بعضوں نے صرف ایک دو سطر پر اکتفا کیا ہے، البتہ خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ نے تاریخ بغداد میں ان کے حالات نسبۃً تفصیل سے لکھے ہیں، اسی طرح حافظ ابن حجر متوفی ۸۵۲ھ نے تہذیب التہذیب میں، امام ذہبی متوفی ۷۴۸ھ نے تذکرۃ الحفاظ، میزان الاعتدال اور العبر فی خبر من غبر میں مزید باتیں بیان کی ہیں، مگر ان میں بھی حالات زندگی کم اور ائمہ جرح و تعدیل کے اقوال و آراء زیادہ ہیں، بہر حال اس وقت امام ابو معشر کے بارے میں ان ہی کتابوں سے یہ معلومات پیش کی جا رہی ہیں۔

نام و نسب اور ولاء | باتفاق مورخین ان کا نام و نسب یہ ہے: ابو معشر نجیح بن عبد الرحمٰن سندی مدنی ہاشمی، یا مولی بنی ہاشم یا مولی المہدی[1]، چونکہ مدینہ منورہ کی طرف نسبت مدنی اور مدینی دونوں سے ہوتی ہے، اس لیے ابن القیسرانی نے ان کو مدینی لکھا ہے[2]، جب کہ عراق کے شہر مدائن کی طرف نسبت مدائنی ہے۔

ان کے سندی النسل والاصل ہونے پر تمام تذکرہ نویسوں کا اتفاق ہے اور سب نے ان کو سندی کی نسبت سے یاد کیا ہے، ان کے صاحبزادے محمد بن ابی معشر جو نہایت ثقہ محدث اور امام ترمذی کے استاد ہیں، بیان کرتے ہیں:

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۴۱۸، تاریخ خلیفہ ج ۱ ص ۱۷، تاریخ کبیر ج ۴ قسم ۲ ص ۱۱۴، المعارف ص ۲۲۰، کتاب الجرح والتعدیل ج ۴ قسم ۱ ص ۴۹۳، الفہرست ص ۱۳۶، تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۲۷ وغیرہ [2] الانساب المتفقہ ص ۷۷۔

کان ابی سندیًا اخرم خیاطًا[1] — میرے والد سندھی تھے، ان کا کان چھدا ہوا تھا، وہ درزی تھے۔

سندھ کے باشندوں میں کان چھدانے کا عام رواج تھا، اور وہ اس بارے میں عرب میں مشہور تھے، امام شعبی متوفی سنہ ۱۰۴ھ نے ایک موقع پر کہا ہے:

واحبب من رأیتہ یعمل بالخیر وان کان اخرم سندیًا[2] — تم جس کو نیک کام کرتے ہوئے دیکھو اس سے محبت کرو، اگرچہ وہ کان چھدا سندھی ہی ہو۔

عام سندھیوں کی طرح ابومعشر کا رنگ سیاہ تھا، ابومسہر کا بیان ہے:

کان ابومعشر اسود[3] — ابومعشر کا رنگ سیاہ تھا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ گورے تھے۔

اسی طرح سندھیوں میں عجمیت و لکنت عام تھی جس کی وجہ سے وہ حروف اور الفاظ کو صحیح مخرج کے ساتھ ادا نہیں کر سکتے تھے، ابوعطا سندی کوفی متوفی بعد سنہ ۱۸۰ھ جیسا مشہور حماسی شاعر اپنی لکنت و ثقل کی وجہ سے صحیح تلفظ سے معذور تھا، اور جرادہ کو زرادہ، جج کو زز اور شیطان کو سیطان کہتا تھا، ابومعشر کی زبان میں بھی لکنت تھی، جس کی وجہ سے وہ بعض حروف و الفاظ صحیح طور سے ادا کرنے سے معذور تھے، ابن القیسرانی نے ان کے تلمیذ ابوالنعیم فضل بن دکین کا یہ قول نقل کیا ہے جس کو امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ اور میزان الاعتدال میں درج کیا ہے:

کان ابومعشر سندیًا وکان رجلا الکن وکان یقول: حدثنا محمد بن کعب — ابومعشر سندھی تھے، ان کی زبان میں لکنت تھی اور حدیث بیان کرتے وقت محمد بن کعب

۱؎ تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۲۸ ۔ ۲؎ طبقات ابن سعد ج ۶، ص ۲۴۸

۳؎ تاریخ بغداد ج ۱۳، ص ۴۲۷ ۔

بن تعب، یرید محمد بن کعب[1] — کہنا چاہتے تھے مگر محمد بن تعب کہہ دیتے تھے۔

ان کی یہی معذوری و مجبوری احادیث کی روایت کے سلسلہ میں صاف اور صحیح طور سے سند نہ بیان کرنے کے اسباب میں سے بڑا سبب بنی، جیسا کہ معلوم ہوگا۔

ابومعشر کے سندی، اخرم، الکن اور اسود ہونے کی ان تصریحات سے ان کا سندی الاصل ہونا بالکل واضح ہے، مگر ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ، میزان الاعتدال اور العبر میں ان کی نسبت "السندی المدنی" بیان کرنے کے باوجود ان کو گورا چٹا اور فربہ لکھا ہے، بلکہ العبر میں یہاں تک لکھ دیا ہے:

قیل لہ السندی من قبیل اللقب بالضد[2] — لقب بالضد کے مطابق ان کو سندھی کہا گیا ہے۔

نیز حافظ ابن حجر نے ان کو "السندی المدنی" لکھنے کے باوجود لکھا ہے:

یقال ان اصلہ من حمیر[3] — کہا گیا ہے کہ ان کی اصل یمن کے قبیلہ حمیر سے ہے۔

حالانکہ یہ اقوال جمہور مورخین کی تصریح کے خلاف ہیں، ابن القیسرانی نے ان کے سندی الاصل ہونے کو نہایت واضح طور سے بیان کر کے اس قسم کے احتمال کی گنجائش نہیں رکھی، وہ انساب و القاب کی تحقیق میں گہری نظر رکھتے تھے، ان کا بیان یہ ہے:

السندی والسندی والسندی والسندی، الاول منسوب الی السند، منہم ابومعشر المدینی السندی مولی بنی ہاشم[4] — ان چار سندیوں میں سے پہلے کی نسبت سندھ کی طرف ہے، ان ہی میں سے ابومعشر مدینی سندی مولی بنی ہاشم ہیں۔

۱؎ الانساب المتفقہ ص ۷۷، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۷، میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۲۹ ۔ ۲؎ العبر فی خبر من غبر ج ۱ ص ۲۵۹ ۳؎ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۹ ۴؎ الانساب المتفقہ ص ۷۷ ۔

ہمارے خیال میں امام ذہبی اور حافظ ابن حجر کے یہ اقوال ابو معشر کے بعد ان کے دو پوتوں حسین بن محمد ابن ابو معشر اور داؤد بن محمد بن ابو معشر کے عالی نسبی کے ادعا کی وجہ سے ہیں، جس سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے دادا کا نسبی تعلق یمن کے شاہی خاندان حمیر یا بنو حنظلہ بن مالک سے ہے، وہ اپنا سلسلۂ نسب حضرت آدم علیہ السلام تک بیان کیا کرتے تھے، اور ان کا اصل نام عبد الرحمٰن بن ولید بن ہلال تھا۔

ابو معشر کے بارے میں عالی نسبی کا دعویٰ

امام ابو معشر کے صاحبزادے محمد بن ابو معشر کا بیان گذر چکا ہے کہ میرے والد سندھی تھے، ان کا کان چھدا ہوا تھا، اور ان کا ذریعۂ معاش خیاطی تھا، باپ کے اس صاف و صریح قول کے مقابلہ میں ان کے دو بیٹوں ابو بکر حسین بن محمد بن ابو معشر اور ابو سلیمان داؤد بن محمد بن ابو معشر نے الگ الگ دعوے کیے ہیں، خطیب بغدادی نے حسین ابن محمد ابن ابو معشر کا بیان نقل کیا ہے کہ میرے والد محمد ابن ابو معشر نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ میرے والد ابو معشر کا نام ان کے چرائے جانے سے پہلے عبد الرحمٰن بن ولید بن ہلال تھا، ان کو چوری کر کے مدینہ میں فروخت کیا گیا، اور بنی اسد کی ایک جماعت نے ان کو خرید کر نجیح نام رکھا، اس کے بعد وہ موسیٰ بن مہدی کی والدہ کے لیے خریدے گئے (فاشتری لام موسیٰ بن المہدی) اور موسیٰ کی والدہ نے ان کو آزاد کر دیا، اس لیے ان کی میراث بنو ہاشم کو ملی اور دیت کی ذمہ داری حمیر پر رہی، اور میرے والد ابو معشر کہا کرتے تھے کہ وہ حنظلہ بن مالک کی اولاد سے ہیں، انھوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنا نسب نامہ حضرت آدم علیہ السلام تک بیان کیا کرتے تھے، اور یہ کہ میرے نزدیک بنی ہاشم کی ولاء اور غلامی بنی حنظلہ کے نسب سے زیادہ محبوب ہے۔[1]

یہ پورا بیان جمہور مورخین کے خلاف ہے، جیسا کہ معلوم ہو گا، ابو معشر کو مدینہ منورہ میں پہلے بنی مخزوم کی ایک عورت نے خریدا، بعد میں مہدی کی ماں ام موسیٰ بنت منصور حمیریہ نے ان کی مکاتبت کی قیمت

[1] تاریخ بغداد ص ۴۲۸۔

ادا کر کے آزاد کر دیا، اور حقِ ولاء اپنے لیے محفوظ رکھا، یہ عورت ام موسیٰ بن مہدی یعنی مہدی کے بیٹے موسیٰ الہادی کی ماں نہیں ہے، بلکہ ام موسیٰ اس کی کنیت قائم مقام نام کے ہے جو خود مہدی کی ماں ہے، موسیٰ بن مہدی کی ماں کا نام خیزران ہے، ام موسیٰ (خیزران) کے ابو معشر کو خریدنے کی صورت میں ان کی دیت حمیر کے ذمہ کیسے ہو گئی؟ خاص طور سے جب کہ وہ قبیلۂ حنظلہ بن مالک سے تھے جو قبیلۂ حمیر سے بالکل جدا قبیلہ ہے، ابو معشر انتہائی بچپن میں مدینہ منورہ لائے گئے، اس عمر میں اپنا نسب نامہ دو چار پشت تک یاد نہیں رہتا ہے چہ جائیکہ حضرت آدم علیہ السلام تک بیان کیا جائے، ان واقعات کے بے اصل ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے راوی کو اہل علم نے غیر ثقہ قرار دے کر اس سے روایت ترک کر دی ہے، اور وہ غیر ثقہ و متروکین میں شامل ہے، خطیب نے لکھا ہے:

ولم یکن بالثقة فترکه	حسین بن محمد بن ابو معشر ثقہ نہیں تھے اس لیے
الناس[1]	لوگوں نے ان سے روایت بند کر دی تھی۔

ان بے بنیاد دعووں کے مقابلے میں دوسرے بھائی داؤد بن محمد بن ابو معشر کا بیان قابل توجہ ہے

حدثنی ابی ان ابا معشر کان	میرے والد نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ ان کے
اصله من الیمن وکان سبیٔ فی	والد ابو معشر کی اصل یمن سے ہے، اور وہ یمامہ
وقعة یزید بن المهلب بالیمامة	و بحرین میں یزید بن مہلب کے واقعہ میں گرفتار
والبحرین، وکان ابیض[2]	کیے گئے، اور وہ گورے تھے۔

اس قول کی تائید کے لیے قرائن پائے جاتے ہیں، یمن اور ہندوستان کے درمیان تجارتی تعلقات بہت قدیم تھے، اور یمن کے حدود میں ہندیوں اور سندھیوں کی آبادیاں تھیں، عہد رسالت سے پہلے وہاں سندھیوں کا کافی زور تھا، ایک مرتبہ وہاں کے حکمراں سیف بن ذی یزن نے ایران کے بادشاہ کسریٰ سے شکایت کی

[1] تاریخ بغداد ج ۸ ص ۹۲ [2] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۲۷۔

کہ میرے ملک پر سیاہ رنگ کے لوگوں نے قبضہ کرلیا ہے، اس پر کسریٰ نے دریافت کیا:

فای السودان غلبوا علیہا الحبشۃ	کن کالوں نے یمن پر قبضہ کیا ہے، حبشی
ام السند[1]	یا سندھی؟

دوسری روایت میں ہے کہ سیف بن یزن نے اجانب کے غلبہ کا شکوہ کیا تو کسریٰ نے پوچھا:

ای الاغربۃ الحبشۃ	کن اجنبی لوگوں نے غلبہ کیا ہے، حبشی
ام السند[2]	یا سندھی؟

ایک بزرگ بیرزطن ہندی یمن میں تھے، جو بھنگ کے ذریعہ علاج کرنے میں مشہور تھے، اور عہد رسالت میں یا اس کے بعد مسلمان ہوئے[3]

ہمارا خیال ہے کہ امام ابومعشر کا خاندان سندھ سے نکل کر پہلے یمن کے اس علاقہ میں آباد ہوا جو یمامہ سے قریب تھا، اس زمانے کا بحرین اسی علاقہ میں تھا جو آج کل سعودی عرب کا منطقہ شرقیہ کہلاتا ہے، آج کا بحرین اس سے دور واقع ہے، قدیم زمانہ میں اس کو اُوال کہتے تھے۔

مذکورہ بالا قول میں اسی قدیم یمامہ و بحرین کے ایک واقعہ کا ذکر ہے جس میں ابومعشر کی گرفتاری بیان کی گئی ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ سنہ ۹۶ھ میں خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے یزید بن مہلب ازدی کو عراقین کی امارت دی، اس نے اشعث بن عبیداللہ بن جارود کو بحرین کا امیر مقرر کیا، اور مسعود بن ابو زینب محاربی نے اس کے خلاف خروج کیا، جانبین میں مقابلہ ہوا، نتیجہ میں یزید بن مہلب کے امیر اشعث ابن عبیداللہ کو شکست ہوئی اور مسعود محاربی بحرین پر قابض ہوگیا[4]، داؤد بن محمد بن ابومعشر کے بیان کے مطابق سنہ ۹۶ھ کی اسی جنگ میں ابومعشر گرفتار کرکے مدینہ منورہ لائے گئے۔

---

[1] تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۱۸ [2] سیرت ابن ہشام ج ۱، ص ۶۳، کتاب التیجان ص ۳۰۲-۳۰۳، طبری ج ۲ ص ۱۱۶
[3] رجال السند والہند، طبع قاہرہ ص ۷۷ [4] تاریخ خلیفہ بن خیاط ج ۱، ص ۳۲۳۔

غلامی، آزادی اور مدینہ منورہ میں مستقل سکونت

امام ابومعشر کا خاندان سندھ سے عرب میں کب، کہاں اور کیسے پہونچا، ان باتوں کے بارے میں یقینی معلومات نہیں ہیں، اگر ان کے پوتے داؤد کا بیان صحیح مان لیا جائے تو ان کا خاندان یمن کے اس علاقہ میں آباد تھا جو یمامہ اور بحرین کے قریب واقع تھا، اور وہیں ان کی پیدائش بھی ہوئی، سنہ ۹۶ھ میں وہ بچپن میں گرفتار کرکے مدینہ منورہ لائے گئے، اس وقت ان کی عمر کتنی تھی؟ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے مدینہ منورہ میں حضرت ابوامامہ ابن سہل بن حنیف متوفی سنہ ۱۰۰ھ رضی اللہ عنہ کو دیکھا، اور ان کی ہیئت یاد رکھی، اور بقول امام ذہبی حضرت سعید بن مسیب مدنی متوفی سنہ ۹۴ھ کا زمانہ نہیں پایا، ہمارا اندازہ ہے کہ ابومعشر آٹھ سال کی عمر میں سنہ ۹۶ھ میں یا اس کے بعد یہاں لائے گئے، اور ان کی پیدائش ۸۸ھ کے حدود میں ہوئی ہوگی۔

امام ابومعشر کی زندگی درحقیقت مدینہ منورہ آنے کے بعد شروع ہوئی، اس سے پہلے ان کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا ہے، ان کے سوانح نگاروں میں ابن سعد، ابن قتیبہ، ابن ابی حاتم رازی کا متفقہ بیان ہے:

وکان مکاتباً لامرأۃ من بنی مخزوم	ابومعشر بنی مخزوم کی ایک عورت کے مکاتب
فادّی وعتق واشترت ام موسیٰ	غلام تھے، اور انھوں نے مکاتبت کی رقم
بنت منصور الحمیریۃ ولائہ[1]	ادا کرکے آزادی حاصل کرلی اور ام موسیٰ بنت
	منصور حمیریہ نے ان کا حق ولا خرید لیا۔

ابن ندیم نے صرف یہ لکھا ہے: وکان مکاتباً لامرأۃ من بنی مخزوم[2] غالباً ان کا نام نجیح ان کی پہلی مولاۃ و مالکہ مخزومیہ نے رکھا تھا، عرب اپنے غلاموں کے نام نیک فالی کے لیے عطاء، افلح، یسار، نجیح وغیرہ رکھتے تھے، مکاتبت یعنی ایک خاص مقدار میں رقم ادا کرنے کی شرط پر آزادی ابومعشر کی پختہ عمر کے

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۳۱۸، المعارف ص ۲۲۰، کتاب الجرح والتعدیل ج ۴ قسم ۱، ص ۴۹۳ [2] الفہرست ص ۱۳۲

بعد ہوئی ہوگی، اور جوانی میں آزادی کے لیے جدوجہد کی ہوگی، جس کے نتیجے میں ام موسیٰ بنت منصور حمیریہ نے مقررہ رقم ادا کر کے ان کو آزاد کر دیا اور حق ولاء اپنے لیے محفوظ رکھا، جو آگے چل کر خلیفہ مہدی کی فرمائش اور خواہش پر بغداد جانے اور درباری اعزاز پانے کا باعث بنا، ام موسیٰ بنت منصور حمیریہ کے بارے میں ابن حزم نے جمہرۃ انساب العرب میں لکھا ہے کہ ابوجعفر منصور نے اموی دور خلافت میں ام موسیٰ حمیریہ سے قیروان میں نکاح کیا تھا، جس کے بطن سے محمد المہدی اور جعفر الاکبر پیدا ہوئے، صورت یہ ہوئی کہ حضرت عبیداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے خاندان کا ایک نوجوان افریقہ کے شہر قیروان پہونچا، جہاں اس نے ام موسیٰ حمیریہ سے شادی کی، اس سے ایک بچی پیدا ہوئی، کچھ دنوں کے بعد وہ جوان قیروان میں فوت ہوگیا، جب اس کی خبر عراق میں اس کے خاندان والوں کو ملی تو ابوجعفر منصور بچی کو لینے کے لیے قیروان گیا، وہاں پہونچنے پر معلوم ہوا کہ ام موسیٰ نے ایک خیاط (درزی) سے دوسرا نکاح کر لیا تھا، جس سے ایک لڑکا پیدا ہوا ہے، اور وہ خیاط بھی انتقال کر چکا ہے، ام موسیٰ حمیریہ نہایت حسین و جمیل تھی، اس لیے ابوجعفر منصور نے اس سے نکاح کر لیا اور اس کے لڑکے کا نام طیفور رکھا، عباسی خلافت میں اس کو طیفور مولیٰ المہدی کہنے لگے، حالانکہ وہ مہدی کا بھائی ہے اور ان دونوں کی ماں ام موسیٰ حمیریہ ہے[1]، اسی طیفور مولیٰ المہدی کو ہارون رشید نے اپنے دور خلافت میں سندھ کی امارت دی تھی، اس وقت یہاں یمانیہ اور نزاریہ کی قبائلی عصبیت اور جنگ برپا تھی، جس کے فرو کرنے میں طیفور ناکام رہا[2]۔

ابومعشر ایام طفلی سے سن شعور تک بنی مخزوم کی ایک عورت کے غلام رہے اور پختہ عمری میں مکاتبت کے ذریعہ آزادی کی کوشش کی، اس درمیان میں ان کی مالکہ نے ان کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ کی، وہ بچپن ہی میں مدینہ منورہ کے فقہاء و محدثین سے تحصیل علم اور کسب فیض کرنے لگے، اور ان میں دینی و علمی کمالات کا ظہور ہونے لگا، حتی کہ ان کی جوانی میں صلاحیت و صالحیت دیکھ کر اعیان و اشراف کی نگاہیں ان کی طرف اٹھنے لگیں اور عبداللہ

---

[1] جمہرۃ انساب العرب ص ۲۱ [2] رجال السند والہند ص ۲۳۳۔

ابن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس (بعد میں خلیفہ ابوجعفر منصور عباسی) کی بیوی ام موسیٰ بنت منصور حمیریہ نے ابومعشر کی مکاتبت کی رقم ادا کر کے آزاد کر دیا اور ان کو اپنی ولاء میں لے لیا، اس کے بعد وہ یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ تحصیل و تکمیل میں لگ گئے۔

حضرت ابوامامہؓ کی زیارت اور تابعیت

امام ابومعشر نے آخری دس سال کے علاوہ پوری زندگی مدینہ منورہ میں بسر کی حتی کہ تحصیل علم کے سلسلہ میں کسی دوسرے شہر جانے کی تصریح نہیں ملتی ہے، ان کے تمام اساتذہ و شیوخ مدنی ہیں، جن میں سے اکثر نے براہ راست حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے کسب فیض کیا ہے، خود ابومعشر کو بچپن میں ایک صحابی حضرت ابوامامہؓ بن سہل بن حنیف انصاری رضی اللہ عنہ کی رویت و لقاء کی وجہ سے تابعیت کا شرف حاصل ہے، ان سے حدیث کی روایت تو نہ کر سکے مگر ان کی حالت و ہیئت کی روایت کی ہے، خطیب بغدادی، امام ذہبی، حافظ ابن حجر وغیرہ نے لکھا ہے:

رأی ابا امامۃ بن سہل بن حنیف[1] — ابومعشر نے ابوامامہ بن سہل بن حنیف کو دیکھا ہے،

حضرت ابوامامہ بن سہل بن حنیف انصاری رضی اللہ عنہ انصار کے قبیلہ اوس سے تھے، ان کی والدہ حضرت حبیبہؓ بنت ابوامامہ سعد بن زرارہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت تھیں، اور نانا حضرت ابوامامہؓ بنی نجار کے نقیب تھے، واقدی نے کہا ہے کہ ابوامامہؓ بن سہل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے گئے، آپ نے ان کا نام اور کنیت ان کے نانا کے نام و کنیت پر ابوامامہ سعد رکھا، انھوں نے اپنے والد حضرت سہلؓ بن حنیف، حضرت عثمانؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت معاویہؓ سے روایت کی ہے، ابن سعد نے ان کو کثیر الحدیث اور ثقہ بتایا ہے[2] خلیفہ بن خیاط نے تصریح کی ہے کہ حضرت ابوامامہؓ بن سہل بن حنیف کی وفات سنہ ۱۰۰ھ میں واقع ہوئی[3]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳، ص ۴۲۷، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۱، تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۹۔

[2] طبقات ابن سعد ج ۵، ص ۸۲ [3] تاریخ خلیفہ ج ۱ ص ۳۳۴۔

ابو معشر نے اپنے بچپن میں حضرت ابو امامہؓ کو ان کے آخری زمانہ میں دیکھا، اس وقت ان سے استفادہ نہ کر سکے، البتہ ان کا حلیہ یاد رکھا، صاحبزادے محمد بن ابو معشر کا بیان ہے:

قال رأیت ابا امامۃ بن سھل بن حنیف شیخاً کبیراً یخضب بالصّفرۃ ولہ ضفیرتان وقد کان رأی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

والد ابو معشر نے کہا ہے کہ میں نے حضرت ابو امامہؓ ابن سہل بن حنیف کو دیکھا ہے، وہ بہت بوڑھے تھے، زرد خضاب استعمال کرتے تھے، ان کے دو۲ چوٹیاں تھیں، اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا۔

اور ان کے شاگرد محمد بن بکار کا بیان ہے:

قال رأیت ابا امامۃ بن سھل بن حنیف یخضب بالحناء ولہ وفرۃ[۱]

ابو معشر نے بتایا ہے کہ میں نے ابو امامہ ابن سہل بن حنیف کو دیکھا ہے، وہ حنا کا خضاب لگاتے تھے، اور ان کے بال بڑے بڑے تھے۔

علمائے رجال وطبقات تابعیت کے لیے صحابی کی صحبت کے قائل ہیں، مگر قول اظہر یہ ہے کہ صحابی کا لقاء تابعیت کے لیے کافی ہے[۲] اس قول کی بنا پر ابو معشر تابعی ہیں۔

تحصیل علم | ابو معشر نے ہوش سنبھالنے کے بعد اپنے کو علم وفضل کی آغوش میں پایا، مدینہ منورہ اجلۂ تابعین اور سادات فقہاء ومحدثین سے معمور ومشحون تھا، ہر گلی کوچہ میں حضرات صحابۂ کرام کے فیض یافتہ علماء وفقہاء تحدیث وروایت میں مشغول تھے، اور ائمۂ کتاب وسنت کے ساتھ اصحاب سیر ومغازی تعلیم وتدریس میں مشغول تھے، خاص طور سے فقہائے سبعہ مدنی علوم کے منتہی ومرجع تھے، یعنی حضرت سعید بن مسیب،

۱؎ تاریخ بغداد ج ۱۳، ص ۴۲۸۔ ۲؎ جواہر الاصول ص ۱۰۶ طبع بیروت۔

حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکر، حضرت عروہ بن زبیرؓ، حضرت خارجہ بن زید بن ثابت، حضرت ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن ابن عوف، حضرت عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ، حضرت سلیمان بن یسار رحمہم اللہ علم نبوت کے امین تھے، نیز اسی دور میں مدینہ منورہ میں حضرت سالم بن عبد اللہ بن عمر، حضرت عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر، حضرت حمزہ بن عبد اللہ بن عمر، حضرت زید بن عبد اللہ بن عمر، حضرت بلال بن عبید اللہ بن عمر، حضرت ابان بن عثمان، حضرت قبیصہ بن ذویب، حضرت اسماعیل بن زید بن ثابت رحمہم اللہ فقہ وفتویٰ اور حدیث میں درجۂ امامت رکھتے تھے[۱] ان حضرات کے علاوہ مدینہ منورہ میں اور بہت سے ائمۂ علم وفضل اور ارباب صلاح اپنے اپنے حلقہ میں دینی وعلمی خدمت انجام دے رہے تھے۔

ابو معشر نے صغر سنی ہی میں اس زمانہ کے مزاج ورواج کے مطابق اپنے مدنی ائمۂ فقہ وحدیث سے سماع وروایت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں تصریح کی ہے کہ ابو معشر نے حضرت سعید بن مسیب سے روایت کی ہے[۲] حضرت سعید بن مسیب کا وصال سنہ ۹۴ھ میں ہوا ہے، اس قول کی رو سے ابو معشر نے بچپن میں ان سے روایت کی ہے، مگر امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ابو معشر نے ابن مسیب کا زمانہ نہیں پایا ہے[۳] اور ابو معشر کے شیوخ حدیث میں حضرت ابو بردہ بن ابو موسیٰ اشعریؓ بھی ہیں، جن کی وفات سنہ ۱۰۳ھ کے آخر یا ۱۰۴ھ کے شروع میں ہوئی ہے، اس وقت ابو معشر کی عمر چودہ ۱۴ پندرہ ۱۵ سال کی رہی ہوگی، اس عمر میں یا اس سے کم میں جمہور محدثین کے نزدیک ذکی الحس اور باشعور بچوں کی روایت صحیح مانی جاتی ہے، خطیب نے الکفایہ میں لکھا ہے:

وقال قوم الحد فی السماع خمس عشرۃ سنۃ، وقال غیرھم ثلاث عشرۃ، وقال جمہور العلماء

ایک جماعت نے کہا ہے کہ سماع حدیث کی حد پندرہ سال ہے، دوسروں نے کہا ہے کہ تیرہ سال ہے، اور جمہور علماء نے کہا ہے کہ جس کی

۱؎ معرفۃ علوم الحدیث ص ۴۳-۴۴۔ ۲؎ تہذیب التہذیب ج ۱۰، ص ۴۲۰۔ ۳؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص ۲۱۶۔

يصح السماع لمن سنه دون ذالك — عمر اس سے کم ہو اس کا سماع بھی صحیح ہے،

وهذا هو عندنا الصواب [1] — ہمارے نزدیک یہی قول درست ہے۔

ان قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابومعشر نے صغر سنی ہی میں بحالت غلامی مدینہ منورہ کے علماء سے کسب فیض کی ابتدا کر دی تھی،

شیوخ واساتذہ | ابومعشر کے شیوخ واساتذہ سب کے سب مدنی ہیں، امام مالک کی طرح ان کا بھی تحصیل علم کے سلسلہ میں مدینہ منورہ سے باہر جانا معلوم نہیں ہوتا ہے، مدینہ منورہ اس وقت علمائے تابعین اور ائمۂ دین کا مرکز تھا، ان کے اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، مگر کتابوں میں چند حضرات کے نام کے بعد والکبار وطائفہ وغیرہ کے الفاظ ہیں، ہم ذیل میں ان کے چند شیوخ کے نام پیش کرتے ہیں:

(۱) سعید بن مسیب قرشی مدنی متوفی ۹۴ھ، مدینہ کے فقہائے سبعہ کے سرخیل اور افقہ اہل الحجاز ہیں، ابوبکر، عمر، عثمان، علی، سعد بن ابی وقاص، حکیم بن حزام، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو بن العاص، ابوذر، ابو درداء، حسان بن ثابت، زید بن ثابت، عتاب بن اسید، عثمان بن ابی العاص، ابوموسیٰ اشعری، ابوسعید خدری، ابوہریرہ، ام المومنین عائشہ، اسماء بنت عمیس، خولہ بنت حکیم، فاطمہ بنت قیس، ام سلیم، ام شریک رضی اللہ عنہم وعنہن وغیرہ سے روایت کی ہے [2]، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے:

رأى ابا امامة بن سهل بن حنيف — ابومعشر نے حضرت ابوامامہ کو دیکھا ہے،

وروى عن سعيد بن المسيّب. — اور سعید بن مسیب سے روایت کی ہے۔

اور امام ذہبی نے لکھا ہے کہ

لم يدرك سعيد بن المسيّب. — ابومعشر نے سعید بن مسیب کو نہیں پایا۔

---

[1] الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۵۴ [2] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۸۴۔

(۲) ابوبردہ بن ابوموسیٰ اشعری مدنی متوفی ۱۰۳ھ یا ۱۰۴ھ مشہور محدث وفقیہ ہیں ان کا نام حارث یا عامر ہے، ایک قول ہے کہ کنیت ہی نام ہے، کثیر الحدیث عالم ہیں، ایک زمانہ میں کوفہ کے قاضی تھے، ابومعشر کے سب سے قدیم الوفاۃ استاذ ہیں، انھوں نے اپنے والد ابوموسیٰ اشعری، علی بن ابوطالب، حذیفہ بن یمان، عبداللہ بن سلام، اغر مزنی، مغیرہ بن شعبہ، ام المومنین عائشہ، محمد بن مسلمہ، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو بن العاص، عروہ بن زبیر، اسود بن یزید نخعی رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے [1]

(۳) محمد بن کعب قرظی مدنی متوفی ۱۱۷ھ اعلم بتاویل القرآن یعنی قرآن کی تفسیر کے سب سے بڑے عالم تھے، انھوں نے عباس بن عبدالمطلب، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود، عمرو بن العاص، ابوذر غفاری، ابودرداء رضی اللہ عنہم سے روایت کی، بعض علماء کے نزدیک ان حضرات سے محمد بن کعب کی روایات مرسل ہیں، نیز فضالہ بن عبید، مغیرہ بن شعبہ، معاویہ ابن ابوسفیان، کعب بن عجرہ، ابوہریرہ، زید بن ارقم، عبداللہ بن عباس، انس بن مالک، عبداللہ بن عمر، براء بن عازب، جابر بن عبداللہ، عبداللہ بن یزید خطمی، عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب اور دیگر حضرات سے روایت کی ہے [2]، محمد بن کعب سے ابومعشر کی جملہ مرویات ائمہ حدیث کے نزدیک معتبر ہیں۔

(۴) سعید بن ابوسعید مقبری مدنی متوفی ۱۱۷ھ والد کا نام کیسان ہے، بنی لیث کی ایک عورت کے غلام تھے، مدینہ منورہ کے قبرستان کے قریب قیام کی وجہ سے مقبری مشہور تھے، انھوں نے عائشہ، ام سلمہ، سعد بن ابی وقاص، ابوہریرہ، معاویہ بن ابی سفیان، ابوشریح، انس بن مالک، جابر بن عبداللہ، عبداللہ بن عمر، یزید بن ہرمز، عبداللہ بن رافع مولیٰ ام سلمہ، سالم بن عبداللہ مولی النصریین، سعید بن یسار، عبداللہ بن قتادہ، اپنے والد ابوسعید، بھائی عباد بن ابوسعید وغیرہ سے روایت کی ہے [3]، طبقات ابن سعد میں ہے کہ وہ ۱۰۰ھ میں عمر بن عبدالعزیز کے دور خلافت میں فوت

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۸ [2] ایضاً ج ۹ ص ۴۲۲ [3] ایضاً ج ۴ ص ۳۸۔

ہوئے ہیں[1]

(۵) نافع مولیٰ ابن عمر مدنی ۱۱۷ھ، ایران کے شہر ابوشہر کے رہنے والے تھے، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو ایک غزوہ میں پایا تھا، انھوں نے اپنے آقا عبد اللہ بن عمرؓ، ابوہریرہؓ، ابولبابہ بن عبد المنذرؓ، ابوسعید خدری، رافع بن خدیج، ام المومنین عائشہ، ام المومنین ام سلمہ، عبد اللہ، عبید اللہ، سالم، زید ابناء عبد اللہ بن عمر، ابراہیم بن عبد اللہ بن حنین، منبہ بن وہب، قاسم بن محمد بن ابوبکر، عبد اللہ ابن ابوبکر، صفیہ بنت ابی عبید، سعید بن ابوہند، مغیرہ بن حکم صنعانی کے علاوہ صحابہ و تابعین کی ایک جماعت سے روایت کی ہے[2]

(۶) محمد بن قیس مدنی متوفی ۱۲۵ھ یعقوب قبطی کے غلام ہیں، کثیر الحدیث عالم ہیں، عمر بن عبد العزیزؒ کے دور خلافت میں قاضی تھے، انھوں نے جابر بن عبد اللہ سے مرسل احادیث کی روایت کی ہے، نیز ابوصرمہ انصاری، عبد اللہ بن قتادہ، عمر بن عبد العزیزؒ، ابوبردہ بن ابوموسیٰ، ابوسلمہ بن عبد الرحمٰن، عبد الرحمٰن بن یزید بن معاویہ سے روایت کی ہے[3]، محمد بن قیس سے ابومعشر کی مرویات بھی محدثین کے نزدیک معتبر ہیں۔

(۷) محمد بن منکدر مدنی متوفی ۱۳۰ھ فقہائے حجاز میں احد الاعلام اور زبردست محدث و فقیہ ہیں، ان کا شمار سادات قراء میں ہے، انھوں نے اپنے والد منکدر بن ہدیر، چچا ربیعہ بن ہدیرؓ، ابوہریرہؓ، ام المومنین عائشہؓ، ابوایوب ربیعہ بن عباد، سفینہ، ابوقتادہ، امیمہ بنت رقیقہ، مسعود ابن حکم زرقی، انس بن مالک، جابر بن عبد اللہ، ابوامامہ بن سہل بن حنیف، یوسف بن عبد اللہ بن سلام، عبد اللہ بن زبیرؓ، عبد اللہ بن عباسؓ، عبد اللہ بن عمرؓ، سعید بن مسیب، عبید اللہ بن ابورافع، محمد بن کعب قرظی وغیرہ سے روایت کی ہے[4]

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۸۶ [2] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۲۰، ۴۲۳ [3] المعارف ص ۲۰۳ [4] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۲۴ تا ۴۷۵۔

ابن سعد نے ان کے شاگرد ابومعشر سندی سے روایت کی ہے کہ محمد بن منکدر کے والد نے ام المومنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے ایک ضرورت ہے، آپ میری مدد فرمائیے، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے، اگر میرے پاس دس ہزار درہم ہوتے تو میں تم کو دے دیتی، ان کے جانے کے بعد ہی خالد بن اسد نے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں دس ہزار درہم بھجوائے، اور انھوں نے یہ ساری رقم منکدر کے یہاں بھجوا دی، انھوں نے اسی رقم میں ایک ہزار درہم کی ایک باندی خریدی، جس کے بطن سے تین فرزند پیدا ہوئے، ان میں سے ایک یہی محمد بن منکدر اور دوسرے دو بھائی ابوبکر بن منکدر اور عمر بن منکدر ہیں، فکانوا عُبّاد اھل المدینۃ اور یہ تینوں بھائی مدینہ منورہ کے عبّاد و زہاد میں ہوئے ہیں[1]

(۸) موسیٰ بن یسار مدنی مطلبی متوفی ــــــھ مشہور عالم مغازی محمد بن اسحاق کے چچا اور قیس بن مخرمہ قرشی کے غلام ہیں، انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے، یحییٰ بن معین نے ان کو ثقہ کہا ہے، اور ابن حبان نے ان کا تذکرہ ثقات میں کیا ہے[2]

(۹) ہشام بن عروہ بن زبیر اسدی مدنی متوفی ۱۴۵ھ نے حضرت عمرؓ کی زیارت کی ہے اور آپ نے ان کے سر پر دست شفقت پھیرا ہے، نیز سہل بن سعد، جابر بن عبد اللہ اور انس بن مالک کے دیدار سے مشرف ہوئے ہیں، انھوں نے اپنے والد عروہ بن زبیر اسدی، چچا عبد اللہ ابن زبیر، دونوں بھائی عبد اللہ بن عروہ، عثمان بن عروہ، چچا زاد بھائی عباد بن عبد اللہ بن زبیر، ان کے بیٹے یحییٰ بن عباد، بیوی فاطمہ بنت منذر، عمر بن خزیمہ، عوف بن حارث بن طفیل، ابوسلمہ بن عبد الرحمٰن بن عوفؓ، محمد بن منکدر، وہب بن کیسان، صالح بن ابوصالح سمان، عبد اللہ بن ابوبکر بن حزم، عبد الرحمٰن بن سعد، محمد بن ابراہیم بن حارث تیمی، محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباسؓ

---

[1] طبقات ابن سعد [2] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۷۷

وغیرہ سے روایت کی ہے[1]۔

(۱۰) موسیٰ بن عقبہ مدنی متوفی ۱۴۱ھ مولیٰ آل زبیر، صاحب المغازی، مدینہ منورہ کے فقیہ و مفتی تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ کا زمانہ پایا ہے، ام خالد بنت خالد اموی صحابیہ سے روایت کی ہے، نیز اپنے نانا ابوحبیبہ مولیٰ زبیر، حمزہ بن عبداللہ بن عمرؓ، سالم بن عبداللہ بن عمرؓ، اعرج، نافع بن جبیر، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوفؓ، نافع مولیٰ ابن عمر، کریب، عکرمہ مولیٰ ابن عباس، محمد بن منکدر، عروہ بن زبیر، زہری وغیرہ سے روایت کی ہے، ثقہ محدث و فقیہ اور مغازی کے زبردست عالم و مصنف تھے، امام مالک اپنے تلامذہ کو ان کی کتاب المغازی سے استفادہ کی تاکید کرتے تھے، اور اس کو اصح المغازی کہتے تھے، امام مالکؒ کا ایک قول یہ ہے کہ موسیٰ بن عقبہ نے کبر سنی میں یہ کتاب لکھی ہے اور دوسروں کی طرح اس میں اطناب و اکثار نہیں ہے، محمد بن طلحہ ابن طویل کا قول ہے کہ مدینہ منورہ میں ان سے بڑا مغازی کا عالم نہیں تھا[2]۔

(۱۱) محمد بن عمرو بن علقمہ لیثی مدنی متوفی ۱۴۴ھ نے اپنے والد عمرو بن علقمہ، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن، عبیدہ بن سفیان، سعید بن حارث، ابراہیم بن عبداللہ بن حنین، عمر بن الحکم لیثی، محمد بن ابراہیم بن حارث تیمی، واقد بن عمرو بن سعد بن معاذ، خالد بن عبداللہ بن حرملہ، عبدالرحمٰن بن یعقوب، عمر بن حکم بن ثوبان، سعد بن سعید انصاری، یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن حاطب وغیرہ سے روایت کی ہے، امام مالکؒ نے موطأ میں ان سے روایت کی ہے، کثیر الحدیث تھے[3]۔

(۱۲) حویرث بن ذباب مدنی متوفی ــــ ھ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی اور ان سے محمد بن ابراہیم بن حارث تیمی نے روایت کی ہے[4]۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۴۰۴ [2] ایضاً ج ۱۰ ص ۳۶۰، العبر ج ۱ ص ۱۴۲

[3] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۷۵ [4] تاریخ کبیر ج ۱ قسم ۲ ص ۱۱۰، کتاب الجرح والتعدیل ج ۱ قسم ۲ ص ۳۰۴

فی الحال ابو معشر کے چند شیوخ و اساتذہ کے یہ نام سامنے آگئے ہیں جن میں اس دور کے مروجہ علوم و فنون کے کاملین اور نمایاں مقام کے مالک ہیں، تلاش و جستجو کے بعد ان میں بہت کچھ اضافہ ہوسکتا ہے۔

اصحاب و تلامیذ

امام ابو معشر کے اصحاب و تلامیذ کا حلقہ بھی ان کے شیوخ و اساتذہ کی طرح بہت وسیع ہے، جن میں حفاظ حدیث، ائمہ جرح و تعدیل، اہل فقہ و فتویٰ اور اصحاب سیر و مغازی سب ہی شامل ہیں، چند حضرات کے نام یہ ہیں:

(۱) سفیان بن سعید ثوری، ابوعبداللہ کوفی متوفی ۱۶۱ھ امیر المومنین فی الحدیث، ابو معشر سے پہلے بصرہ میں فوت ہوئے۔

(۲) عبدالرحمٰن بن مہدی عنبری، ابوسعید بصری متوفی ۱۹۸ھ مولیٰ بنی عنبر یا مولیٰ بنی ازد، جرح و تعدیل کے امام ہیں۔

(۳) عبدالرزاق بن ہمام حمیری، ابوبکر صنعانی متوفی ۲۱۱ھ مولیٰ حمیر، صاحب المصنف۔

(۴) وکیع بن جراح، ابوسفیان کوفی متوفی ۱۹۶ھ، امام ابوحنیفہ کے شاگرد اور امام شافعیؒ کے استاد ہیں۔

(۵) لیث بن سعد فہمی، ابو الحارث مصری متوفی ۱۷۵ھ مولیٰ بنی قیس، اصفہانی الاصل اور دیار مصر کے شیخ و عالم ہیں۔

(۶) سعید بن منصور، ابوعثمان خراسانی مکی متوفی ۲۲۷ھ صاحب السنن، ایک واسطہ سے امام بخاری کے استاد ہیں[1]۔

(۷) محمد بن عمر، ابوعبداللہ واقدی مدنی متوفی ۲۰۷ھ مولیٰ بنی اسلم، مشہور محدث و مورخ

---

[1] ان کے مفصل حالات ہماری کتاب مآثر و معارف میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

اور بغداد کے قاضی ہیں۔

(۸) منصور بن ابی مزاحم بشیر، ابو نصر ترکی بغدادی متوفی ۲۳۵ھ مولی ازد۔

(۹) محمد بن بکار بن ریان ہاشمی، ابو عبداللہ متوفی ۲۳۳ھ مولی بنی ہاشم، صحیح مسلم میں ان کی حدیثیں مروی ہیں۔

(۱۰) محمد بن سوار، سدوسی عنبری، ابو الخطاب بصری متوفی ۱۸۷ھ، ان کے واسطے سے امام ترمذی نے ابو معشر سے روایت کی ہے۔

(۱۱) بشیر بن ولید، ابو الولید کندی متوفی ۲۳۸ھ صاحب القاضی ابو یوسف، احناف کے ائمۂ کبار میں سے ہیں، مہدی اور مامون کے دور میں قاضی تھے۔

(۱۲) عبداللہ بن مبارک حنظلی تمیمی، ابو عبدالرحمن مروزی متوفی ۱۸۱ھ مولی بنی تمیم۔ شیخ الاسلام، ان کی کتاب الزہد والرقائق میں ابو معشر سے روایت موجود ہے۔

(۱۳) یزید بن ہارون، ابو خالد واسطی متوفی ۲۰۶ھ مولی بنی سلیم، ثقہ وصاحب حفظ الحدیث ہیں۔

(۱۴) عاصم بن علی، ابو الحسن واسطی متوفی ۲۲۱ھ مولی بنی تیم، واسط میں انتقال کیا۔

(۱۵) عبداللہ بن ادریس اودی زعافری، ابو محمد کوفی متوفی ۱۹۲ھ، اہل مدینہ کے فقہی مسلک پر فتویٰ دیتے تھے۔

(۱۶) عثمان بن عمر عبدی، ابو محمد بصری متوفی ۲۰۸ھ، ایک قول کے رو سے بخاری الاصل ہیں۔

(۱۷) ہاشم بن قاسم، ابو نصر لیثی بغدادی متوفی ۲۰۶ھ، اہل بغداد ان کے وجود پر فخر کرتے تھے۔

(۱۸) ہشیم بن بشیر، ابو معاویہ بن ابی حازم واسطی متوفی ۱۸۳ھ مولی بنی سلیم ایک قول کے مطابق بخاری الاصل ہیں۔

(۱۹) ہوذہ بن خلیفہ، ابو الاشہب ثقفی بصری متوفی ۲۱۵ھ، امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد ہیں،

(۲۰) انس بن عیاض، ابو حمزہ لیثی مدنی متوفی ۲۰۰ھ، نہایت ثقہ کثیر الحدیث عالم ہیں۔

(۲۱) فضل بن دکین، ابو نعیم کوفی متوفی ۲۱۹ھ نے امام ابو حنیفہ سے بہت زیادہ روایت کی ہے۔

(۲۲) سلیمان بن داؤد، ابو الربیع زہرانی بصری متوفی ۲۳۴ھ، بغداد میں قیام کرتے تھے۔

(۲۳) محمد بن مطرف، ابو غسان لیثی مدنی متوفی ۱۶۳ھ، عسقلان میں رہتے تھے۔

(۲۴) حجاج بن محمد الاعور، ابو محمد مصیصی متوفی ۲۰۶ھ مولی سلیمان بن مجالد، ترمذی الاصل ہیں، بغداد میں رہتے تھے، بعد میں مصیصہ چلے گئے تھے۔

(۲۵) محمد بن ابو معشر سندی، ابو عبدالملک بغدادی متوفی ۲۴۷ھ اپنے والد ابو معشر کے خاتمۃ الاصحاب ہیں[1]

(۲۶) علی بن مجاہد کابلی، ابو مجاہد کندی متوفی ۱۸۰ھ صاحب کتاب المغازی مولی کندہ۔

(۲۷) اسحاق بن قیس، طبری نے تاریخ میں اسحاق بن قیس عن ابی معشر کی سند سے متعدد واقعات بیان کئے ہیں۔

امام ابو معشر کے تذکرہ نویس علماء نے روی عنہ کے ذیل میں ان کے بعض تلامذہ کے نام لکھ کر وطائفۃ واخرون اور وغیرہم لکھ دیا ہے، سردست یہ چند نام سامنے کے ہیں ورنہ ان کے تلامذہ اور اصحاب کی فہرست طویل ہے۔ (باقی)

---

[1] ان حضرات کے حالات کے لیے تہذیب التہذیب، طبقات ابن سعد، معارف ابن قتیبہ وغیرہ ملاحظہ ہوں۔

تلخیص و تبصرہ

مستشرقین کے نزدیک نبوت اور وحی کے دلائل

رابطۂ عالم اسلامی سے ایک کتاب "الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فی کتابات المستشرقین" مولفہ استاذ نذیر حمدان موصول ہوئی ہے، مذکورۂ بالا عنوان اس کتاب کے پہلے باب کا ایک حصہ ہے، اس کی تلخیص ذیل میں درج ہے۔

مستشرقین نے نبوت اور وحی کے جو دلائل بیان کیے ہیں ان میں پہلی دلیل کا تعلق ایمان باللہ کے عقیدہ سے ہے۔

اسلام میں ایمان باللہ کی اولین بنیاد توحید کا عقیدہ ہے، یہ اپنی خصوصیات اور تفصیلات کے ساتھ اس قدر ستھری اور نکھری ہوئی صورت میں پیش کیا گیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل ایسی صورت میں نہیں تھا، یہاں تک کہ ان حنفاء کے یہاں بھی امتداد زمانہ سے توحید کا عقیدہ خالص نہیں رہ گیا تھا جو ملت ابراہیمی کے متبع سمجھے جاتے تھے، وہ اگرچہ خدائے واحد کو زمان و مکان اور جسم و جہت سے منزہ سمجھتے تھے، لیکن اس کی حاکمیت، تشریع اور تجرید کے بارہ میں ان کا ذہن صاف نہیں تھا۔

اسی طرح تورات میں الٰہ کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ عام اور ہمہ گیر نہیں ہو سکا، بلکہ یہ صرف بنی اسرائیل اور ان کے انبیاء کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا۔

موجودہ اناجیل کی توحید میں تثلیث کا تصور ہے، ان میں تین[۳] اقانیم کا اعتبار کیا گیا ہے جو الگ الگ

بھی خدا سمجھے جاتے ہیں اور ان کا مجموعہ بھی خدا کہلاتا ہے، اسی لیے حضرت مسیح کی ذات کے متعلق عیسائیوں کے مختلف فرقے ہو گئے ہیں۔

بعثت نبوی سے قبل توحید سے متعلق اسی قسم کے تصورات لوگوں میں رائج تھے، لیکن اسلام اور پیغمبر اسلام نے ان سے الگ توحید کا ایسا نیا تصور پیش کیا جس کو نہ آپ نے تورات و انجیل میں پڑھا تھا، اور نہ کسی حنیفی (ملت ابراہیمی کے متبع) سے سیکھا تھا، چونکہ یہ تصور اور عقیدہ عین بشری میلانات اور انسانی فطرت کے مطابق تھا، اس لیے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور نبوت کی ایک دلیل ہے۔

اسی حقیقت کو مشہور مستشرق کونٹ ہنری ڈی کاشٹری نے اپنی کتاب "اسلام شخصیات اور تصورات" میں بھی بیان کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ اس بات کو باور کرنا محال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم توحید کے جس فکر و تصور کے داعی تھے، اسے آپ نے تورات اور انجیل کے مطالعہ سے حاصل کیا تھا، کیونکہ اگر آپ نے یہ کتابیں پڑھی ہوتیں تو آپ نے تثلیث کی تردید ضرور کی ہوتی، کیونکہ یہ آپ کی فطرت اور وجدان کے سراسر خلاف چیز تھی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عقیدہ کا ظہور خود آپ کی زندگی کا نہایت مہتم بالشان واقعہ ہے جو بذاتہٖ خود آپ کے سچے اور صادق و امین نبی ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے (یورپ اور اسلام ص ۴۲) نیز یہی اسلام کے برحق ہونے کی غالباً سب سے واضح دلیل بھی ہے کیونکہ اسلام میں توحید کا جو عقیدہ ہے اس سے یہ دوسرے مذاہب سے بالکل ممتاز نظر آتا ہے۔

اسلام میں معبود صرف ایک ہی ہے، اسی کی ہم عبادت اور پیروی کرتے ہیں، ہمارے نزدیک سب سے اہم اور مقدم یہی عقیدہ ہے، کوئی ہستی بھی اتنی مقدس اور پاکیزہ نہیں ہے کہ ہم اس کو خدا کا شریک اور ساجھی بنائیں، یہ کیسی عجیب و غریب بات ہے کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے، ایسی پستی اور بے وقوفی پر اتر آئے اور ایسے اوہام و خرافات کو اپنا عقیدہ بنالے جو اس کی نگاہوں سے

اس کے اس مقدس باپ (خدائے قہار) کو اوجھل کر دیں، جو اپنے بندوں اور مخلوقات سے ہر وقت متصل اور جڑا ہوا رہتا ہے، خواہ یہ بندے اس کے نافرمان اور باغی ہوں یا مطیع و فرمانبردار۔

۲. قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بلیغ معجزہ ہے

عربی زبان و ادب کے ماہر مستشرقین اسلوب اور مضمون کے اعتبار سے قرآن مجید اور احادیث نبوی کے درمیان موازنہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ ان کا اسلوبِ بیان بھی مختلف ہے، اور معانی و محتویات کے اعتبار سے دونوں کے مضامین بھی جدا جدا ہیں۔

قرآن مجید کا اسلوب لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے ایسا معجزانہ ہے جو اس کے کلام ربانی ہونے کا پتہ دیتا ہے، اور حدیث کے اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک فائق و برتر انسان کی قوت بلاغت کا نمونہ ہے، اسی طرح قرآن کے مضامین و مطالب زیادہ تر عام اور کلی نوعیت کے ہوتے ہیں، جب کہ حدیث کے مندرجات و مشمولات قرآن کے بنیادی احکام کی تفصیل، توضیح اور تشریح پر مبنی ہوتے ہیں گو کہیں کہیں اس میں بعض نئے احکام و قوانین بھی پائے جاتے ہیں، قرآن مجید نے برابر چیلنج کیا ہے، اور ہمیشہ کرتا رہیگا کہ لوگ لفظاً و معناً اس کے جیسی کوئی کتاب پیش کریں، اس سے لازماً یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایسی وحی ہے جس کا سرچشمہ کوئی بالاتر ہستی ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

ڈاکٹر لورا ویشیا واگلیری نے بھی ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کا معجزہ اس کی بلاغت ہے، اور اس کی وہ خبریں ہیں جو اس کی سورتوں اور آیتوں میں بیان کی گئی ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

"اسلام کا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے، جو تواتر و تسلسل کے ساتھ نقل ہوتا چلا آ رہا ہے اور اس کے واقعات پورے یقین اور کامل وثوق کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، اس برحق کتاب کی نقل و محاکات کی کوئی گنجائش نہیں، اس کی تمام آیتیں بلاغت کے یکساں معیار پر ہوتی ہیں، اور وہ ایک موضوع چھوڑ کر دوسرے موضوع کی جانب منتقل ہو جاتا ہے، مگر اس کا زور بیان برقرار رہتا ہے، ہم کو اس کے اندر گہرائی کے ساتھ شیرینی بھی ملتی ہے، حالانکہ عموماً یہ دونوں خوبیاں ایک ساتھ جمع نہیں ہوتیں، ایسی معجزانہ کتاب کو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اختراع قرار دینا بعید از عقل ہے، کیونکہ آپ ایک عرب اُمّی تھے"

(اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۰۵)

مستشرق ایٹن ڈینہ لکھتا ہے کہ:

"قرآن کا اعجاز اس انداز کا ہے جس کو اختیار کرنا بڑی سی بڑی علمی و ادبی اکیڈمی کے امکان سے باہر ہے، اور یہ اس کے اعجاز ہی کا نتیجہ ہے کہ گو عربی زبان ساری دنیا میں پھیل چکی ہے لیکن اگر آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی صحابی دوبارہ تشریف لائیں تو انھیں عربی زبان بولنے والوں کی باتیں سمجھنے اور مختلف قبیلوں سے باتیں کرنے میں کوئی دقت اور دشواری نہ پیش آئے گی، اس کے برخلاف اگر پندرہویں صدی کے فرانسیسی رابیلے کا کوئی معاصر آج کے فرانسیسی لوگوں کی بڑی تعداد سے تخاطب کرے تو اسے بڑی دشواری پیش آئے گی، حالانکہ پندرہویں صدی قرآن کی صدی کے مقابلہ میں ہم سے زیادہ قریب ہے۔

گو قرآن کی زبان کے اصول و ضوابط صدیوں پہلے مرتب و مدون کیے جا چکے ہیں، مگر اس میں اتنی لچک اور وسعت ہے کہ موجودہ ایجادات اور نئی نئی اختراعات کی تعبیر سے نہ تو عربی زبان قاصر ہے اور نہ اس کی وجہ سے اس کی روانی اور سلاست میں کوئی فرق آ سکتا ہے۔

(اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۰۵)۔

۳. قرآن کے وحی الٰہی ہونے کی تاریخ بھی تائید کرتی ہے۔

جس طرح بعض مستشرقین کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمّی ہونا اور گذشتہ آسمانی کتابوں سے کوئی خوشہ چینی نہ کرنا ثابت ہے اسی طرح وہ اسے بھی تسلیم کرتے ہیں اور تاریخ بھی اس پر شاہد ہے کہ قریش میں سے اکثر لوگ قرآن کی اثر انگیزی اور دلآویزی کی وجہ سے حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے، انھیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ کتاب خدا کی طرف سے اس کے نبی پر اتاری گئی ہے، اس لیے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کی اور آپ پر ایمان لائے، گذشتہ طویل تاریخ اس کی بھی شہادت دیتی ہے کہ قرآن مجید کا نقل نہایت صحیح ہے،

اور ہر قسم کے مادی انقلابات اور گوناگوں فکری رجحانات کے رونما ہونے کے باوجود وہ ہر قسم کے تغیر و تحریف سے محفوظ ہے، آج مسلمان جس قرآن کی تلاوت کرتے ہیں وہ بعینہ وہی ہے جو آنحضرتؐ پر اتارا گیا تھا، کیا یہ بات خود ایک معجزہ نہیں ہے کہ تاریخ کے گوناگوں واقعات و حوادث کے باوجود مسلمان قرآن کی تلاوت میں اس کے اسی طریقہ کو مشروع سمجھتے ہیں جس طریقہ پر یہ آنحضرتؐ پر وحی کے ذریعہ سے اتارا گیا تھا، یہ بھی قرآن کا معجزہ ہے کہ موجودہ دنیا کی ایک تہائی سے زیادہ آبادی کا اس پر ایمان ہے، اور اس تعداد میں برابر اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

قرآن مجید کے اس اعجاز کی طرف بہت سے مستشرقین بھی مائل ہوئے اور انھوں نے اس کے بعض پہلوؤں کی وضاحت کی ہے، کاؤنٹ ہنری نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ عقل حیران ہے کہ اس طرح کی آیتیں بھلا ایک امی شخص کس طرح بیان کر سکتا ہے، سارے مشرق کو اعتراف ہے کہ لفظاً و معنیً ایسی آیتیں پیش کرنے سے انسانی فکر قاصر ہے، یہی وجہ ہے کہ عتبہ بن ربیعہ نے قرآن کی جب آیتیں سنیں تو وہ مبہوت ہو گیا، قرآن کی عظمت کے لیے یہ کافی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ اس کے سامنے سرنگوں ہو گئے اور خدا پر ایمان لائے، اور جعفر بن ابی طالبؓ نے جب نجاشی کے سامنے قرآن کی ایک سورہ کی تلاوت کی تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، کوزان ڈی بیر سوپھال نے اس طرح کی تمام روایتوں کو نقل کیا ہے۔ (یورپ اور اسلام ص ۴۳)

ڈاکٹر لورا ویشیا قرآن کے الہامی اور امتداد زمانہ کے باوجود اب تک ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہونے کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتی ہیں "ہمارے نزدیک قرآن کے وحی الٰہی ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ وہ اپنے نازل کیے جانے کے بعد سے اب تک ہر قسم کی تحریف و تغیر سے محفوظ ہے اور اللہ کے حکم سے وہ آئندہ بھی ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ (اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۰۷)

۳۔ قرآن کے قوانین کی جامعیت | قرآن مجید کا مکمل و جامع قانون و دستور ہونا بھی نبوت محمدیؐ کی تائید کا ایک

ثبوت ہے، کیونکہ خواہ کوئی شخص حیرت انگیز قانونی ذہن و دماغ اور غیر معمولی قانونی مہارت ہی کیوں نہ رکھتا ہو، اس درجہ مکمل شریعت اور جامع قوانین پیش نہیں کر سکتا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک امی تھے، آپؐ نے نہ تو شرائع و قوانین کی کسی کتاب کا مطالعہ کیا تھا اور نہ ہی انسانی حقوق و معاملات کی کسی کتاب سے آپ کو واقفیت تھی، ایسی صورت میں آپؐ کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک ایسا قرآن پیش کر دیں جو انسان کی دنیوی و اخروی زندگی کے لیے مکمل لائحہ عمل اور جامع دستور ہو۔

آپؐ کی بعثت سے پہلے دنیا میں متعدد آسمانی و انسانی قوانین رائج تھے، قانون حمورابی سے لے کر قانون روما تک موجود تھے، گذشتہ انبیاءؑ کی شریعتیں بھی تھیں جن میں حق، عدل، نظام حکومت، حقوق اور فرائض کے کلی و جزئی پہلوؤں کی وضاحت کی گئی تھی، اور ان کے علاوہ بہت سے قوانین و شرائع محو اور معدوم ہو جانے کے قریب ہو گئے تھے، ان کے مقابلہ میں اسلام کے نظام قضاء، دستور حکومت اور اس کی اقتصادی، مالیاتی اور فوجی تنظیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی قانون و شریعت کسی شخص کے ذہن و فکر کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر خدا کے سارے احکام موجود ہیں، جن کا الہام رسول اللہؐ پر ہوا تھا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صحت و صداقت کی یہ بھی دلیل ہے کہ آدمی کے احترام، عدل، مساوات، رواداری، مسلم و غیر مسلم کے تعلقات اور امن و جنگ کے زمانہ کے احکام کے متعلق اسلامی حکومت کے منظم ضوابط چودہ سو برس سے دنیا میں رائج چلے آرہے ہیں، اور آئندہ بھی یہ جاری رہیں گے۔

تمدنی اور تہذیبی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حصول علم، مکارم اخلاق، احترام عقل، اثبات حق اور عام انسانی معاملات کی جانب توجہ کرنے کی جو دعوت دی ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کے احکام اور تمدنی افکار آپؐ کو خدا کی جانب سے عطا کیے گئے تھے

ویانا یونیورسٹی کے لا کالج کے پرنسپل ڈاکٹر شیرل نے ۱۹۲۷ء میں قانون دانوں کی ایک کانفرنس میں کہا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے امی ہونے کے باوجود کئی صدی پیشتر دنیا کو ایک ایسا مکمل قانون اور جامع دستور عطا کیا تھا جس کی بلندی پر اگر ہم یورپ والے دو ہزار برس بعد بھی پہونچ جائیں تو خوش قسمت ہوں گے۔ (اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۹۶)

ایک ولندیزی مستشرق ڈاکٹر کرسٹان اسنوک ہرجرنج نے ہالینڈ کی حکومت کے کونسلر کی حیثیت سے سترہ برس مشرقی ہند میں گذارے، اور تقریباً ربع صدی تک اس نے اسلامی ملکوں کی سیاحت بھی کی، اس عرصہ میں اس کو اسلامی قوانین کے مطالعہ کا موقع بھی ملا، اس نے ان ملکوں کی دینی تحریکوں کا جائزہ بھی لیا، وہ رقمطراز ہے کہ "عیسائی مشنریوں کو امید ہے کہ تمام مذاہب ان کے اندر ضم ہو جائیں گے لیکن اسلام کے بارہ میں ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ ایک طاقتور، متحرک اور فعال مذہب ہے اور اسکے احکام و قوانین انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر گوشہ سے متعلق ہیں"

ڈاکٹر شبلے شمیل کا کہنا ہے کہ قرآن نے جو اجتماعی اصول بیان کیے ہیں وہ عام اور ہمہ گیر ہیں، اور ان کے اندر نرمی اور لچک بھی ہے، اس لیے وہ ہر زمانہ اور ہر جگہ کے لیے مناسب اور موزوں ہیں۔

قرآن مجید نے انسان کے لیے دنیا و آخرت دونوں کے دروازے وا کر دیے ہیں، اور اس کے جسم و روح دونوں کی ترقی کے اسباب و وسائل مہیا کر دیے ہیں جب کہ دوسرے مذاہب نے عمل و ترقی کے دروازے مسدود کر کے آدمی کو اس دنیائے فانی سے بالکل دامن کش اور بیزار رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ (اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۱۲)

۵. اسلام کی دوامی اور آفاقی حیثیت اور اس کی مقبولیت

صدیوں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بھی اپنی اصلی حالت اور حقیقت پر اسلام کا باقی اور پائیدار رہنا در اصل اس کے ہر زمانہ کے لیے مناسب اور سازگار ہونے کی دلیل ہے، اس کی دعوت ابھی کی طرح حال و مستقبل میں بھی قائم اور پائیدار رہے گی

جس کو لوگ گرم جوشی سے قبول و اختیار کرتے ہیں، اور اس کے آئین و احکام کی پابندی کرنے کے لیے پریشان رہتے ہیں، یہ اس کے کامل و مکمل دین ہونے کا ثبوت ہے، یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے سوا دنیا کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ کسی دعوت کو شوق، رغبت اور محبت کے ساتھ قبول کرنے والوں کی تعداد میں اس طرح روز بروز اضافہ ہوتا رہا ہو اور وہ اس کی تبلیغ و اشاعت کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دینے میں کوئی دریغ محسوس نہیں کرتے۔ مستشرق اٹین ڈینہ نے اس دلیل کو زیادہ موثر طریقہ پر بیان کیا ہے، وہ لکھتا ہے: "گذشتہ چند برسوں میں یورپ کے مختلف علاقوں کے بہت سے عیسائی مسلمان ہو گئے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے، لندن اور لیورپول میں صحیح اسلامی مزاج رکھنے والی بعض جماعتوں کے اندر سرگرم دو نو مسلم انگریز بھی شامل ہیں۔ (مشرق مغرب کی نظر میں بحوالہ یورپ اور اسلام ص ۲۱۲) اس کا یہ بھی خیال ہے کہ جو عیسائی دائرۂ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں خواہ وہ یورپ کے یا امریکہ کے ہوں، ان سب کا تعلق خواص کے طبقے سے ہے، ان کے اخلاص اور نیک نیتی میں کوئی شبہ نہیں، ان کے پیش نظر کوئی مادی غرض نہیں ہے، اس نے مثال میں ایک انگریز لارڈ ہیڈلی اور ایک مسیحی شرسینی کا نام بھی دیا ہے، عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں اب ایسی کتابیں مرتب کی جا چکی ہیں، جن میں ہزاروں افراد اور جماعتوں کے حلقہ بگوش اسلام ہونے والوں کے ناموں کی فہرست درج ہے، اس فہرست میں مرد اور عورتوں دونوں کے نام ہیں۔

گستاپ لیبان کہتا ہے کہ قرآن کی حیثیت ایک دینی، سیاسی اور اجتماعی قانون کی ہے، اس کے احکام کا نفاذ دس صدیوں سے زیادہ سے ہو رہا ہے گبن کہتا ہے کہ بحر اوقیانوس اور اٹلانٹک کے ساحلوں سے لے کر دریائے جانجس تک قرآن کو ایک اساسی دستور کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے، اس کے اندر صرف دین کے اصول ہی بیان نہیں کیے گئے ہیں، بلکہ جنایات اور شہری زندگی کے احکام اور وہ قوانین بھی بیان کیے گئے ہیں جن پر اسلامی طرز زندگی کا دار و مدار ہے (اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۰۰)

جو لوگ اسلام کو جھوٹا اور غلط مذہب قرار دینے پر مصر ہیں ان پر اظہار تعجب کرتے ہوئے کارلائل لکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس پیغام کی دعوت دی ہے وہ کروڑوں انسانوں کے لیے چودہ سو برس سے آفتاب درخشاں کے مانند جگمگا رہا ہے، بھلا یہ کسی جھوٹے کا جھوٹ اور مکار کا فریب ہو سکتا ہے، اگر جھوٹ، فریب، گمراہی اور ضلالت کا اتنے بڑے پیمانے پر رواج ہو جائے تو زندگی بے سود، عبث اور معدوم ہو جائے گی۔

۶۔ بعثت سے قبل ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اور امانت کی اس قدر شہرت ہو گئی تھی کہ آپؐ امین کے لقب سے موسوم کیے جاتے تھے، مستشرقین نے آپؐ کے اس لقب پر اتنا زور دیا ہے کہ بعض لوگوں کو آپؐ کا نام ہی مشتبہ ہو گیا ہے، اور وہ آپؐ کے اصلی نام (محمدؐ) کا سرے سے ذکر ہی نہیں کرتے۔

جھوٹ خواہ اپنے اوپر گھڑا جائے یا دوسروں کے خلاف افترا پردازی کی جائے، یہ دونوں ہی صورتیں ایک ایسی دعوت کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں جو دنیا کو اپنی روشنی سے منور کرنا چاہتی ہے، اور کسی بھی داعی کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی دعوت کی کامیابی کی خاطر اپنے لوگوں میں یا دوسروں کے سامنے مستقل اور مسلسل کذب و دروغ سے کام لے، کارلائل کہتا ہے:۔

"کیا کوئی جھوٹا آدمی جو تعمیر کے مختلف قسم کے ساز و سامان اور ان کی خصوصیات سے نا واقف ہو، اینٹوں کا کوئی مکان بنا سکتا ہے، اگر وہ بنائے بھی تو ملے جلے ساز و سامان کا ایک ڈھیر ہی تو ہوگا، ایسی صورت میں تمھاری اس شخص کے متعلق کیا رائے ہوگی جس نے ایسی عمارت بنائی ہے جس کے ستون گذری ہوئی متعدد صدیاں ہیں اور اس کے اندر لاکھوں کروڑوں انسان رہ رہے ہیں، اس بنا پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا، ریاکار، نمائش پسند اور حیلہ ساز سمجھنا انتہائی غلط ہے، آپؐ نے کسی مقصد یا لالچ کی خاطر کبھی غلط وسائل و ذرائع نہیں اختیار کیے، آپؐ نے جو پیغام دنیا کو پہونچایا

وہ سچا اور برحق تھا، اور آپؐ کا کلمہ بھی ایک صدائے حق تھا جو نامعلوم عالم سے ظاہر ہوا تھا، اس نے ساری دنیا کو روشن کر دیا تھا، یہ سب کچھ خدا کے حکم اور فضل سے ہوا، اور اللہ اپنا فضل جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔"

دوسری جگہ کارلائل آپؐ کے اوصاف و خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رہن سہن، اکل و شرب، لباس اور پوشاک اور دوسرے تمام معمولات و معاملات میں نہایت سادگی پسند تھے، آپؐ کی غذا عموماً پانی اور روٹی ہوتی، مہینوں گذر جاتے مگر آپ کے گھر میں چولھا بھی نہیں جلتا تھا، کیا اس سے بڑھ کر بھی عزت و فخر کے لائق کوئی بات ہو سکتی ہے، محمدؐ قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ایسی سادہ زندگی بسر کی اور اللہ کے دین کی اشاعت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور لوگ جن چیزوں کی حرص و طمع کرتے ہیں، یعنی عہدہ، منصب، حکومت اور اقتدار انھوں نے ان چیزوں کی کبھی طمع نہیں کی۔"

مستشرقین نے ان کے علاوہ بھی آپ کی نبوت کے دوسرے دلائل بیان کیے ہیں جو احادیث سے ماخوذ و مستنبط ہیں، یا ان کا تعلق ان بشارتوں سے ہے جن کا ذکر گذشتہ آسمانی کتابوں میں ہے، یا غیب کے بارہ میں آپؐ کی پیشین گوئیوں سے ہے۔

وحی الٰہی کی صورتیں اور قسمیں

دلائل نبوت اور اقسام وحی کے مسئلہ میں معتبر اور اعتدال پسند مستشرقین ان اسلامی مصادر و ماخذ پر اعتماد کرتے ہیں جو کتب احادیث و سیر سے ثابت ہیں، اور گذشتہ نبیوں اور پیغمبروں کے حالات و سوانح کے سلسلہ میں ان کا دار و مدار تاریخ کے واقعات و حقائق پر ہوتا ہے، مگر اسی کے ساتھ وہ اپنے نفسیات اور علم الاجتماع کے مطالعہ اور ذاتی رائے کو بھی شامل کر دیتے ہیں، پس جن مباحث میں ان کا اعتماد ثابت اور تسلیم شدہ اسلامی ماخذ پر ہوتا ہے، وہ یقیناً قابل قبول ہیں، ان میں کسی بحث و کلام یا اختلاف و نزاع کی گنجائش نہیں، رہا نبوت کے بارہ میں ان کا

تاریخی حقایق پر اعتماد تو اس سے بھی ان کے دلائل وشواہد کو تقویت حاصل ہوتی ہے، مگر جب وہ ان کے اندر اپنے ذاتی اجتہاد وتاثر اور جائزہ ومطالعہ کو بھی شامل کر دیتے ہیں تو اس وقت قیل وقال، رد وکد اور بحث ونزاع کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے، اسی بنا پر نبوت اور وحی کی قسموں کے بارہ میں مستشرقین کے کئی موقف ہو گئے ہیں۔

ا۔ محمد رسول اللہ

مستشرقین کی کتابوں میں رسول کی نبوت اور وحی کی مختلف قسموں جیسے رویائے صادقہ اور حضرت جبرئیل ؑ کی لائی ہوئی وحی پر بحث وگفتگو کی گئی ہے، اٹین ڈینیہ نے رسول اللہ ؐ کی خلوت اور تنہائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ آپ ؐ کے قلب کو مصفّٰی ومجلّٰی بنا دیتی تھی، اور دنیا کے مشاغل سے اسے پاک وصاف کر دیتی تھی...... رویائے صادقہ کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سچے اور روشن خواب دیکھتے تھے، اور آپ کو ایسی ندا سنائی دیتی تھی جس کے متعلق آپ کو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہ کہاں سے آرہی ہے...... وحی کے بارہ میں وہ بیان کرتا ہے کہ جب خدائے رحمان کی رافت ورحمت اپنے بندوں پر نازل ہوتی ہے تو وہ ان کے پاس اپنے رسول کے واسطہ سے وحی بھیجتا ہے،...... ایک یادگار رات یعنی شب قدر میں پورا قرآن لوح محفوظ سے دنیوی آسمان پر نازل کیا گیا...... اسی مبارک شب میں قرآن کی پہلی آیتیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری گئیں...... حضرت جبرئیل ؑ کو حضرت محمد ؐ نے دیکھا، یہ وہی فرشتے ہیں جو خدا کے نبی حضرت دانیال ؑ اور حضرت مریم ؑ کے پاس بھی آئے تھے،...... حضرت جبرئیل ؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مختلف شکل وصورت میں تشریف لاتے تھے۔

پھر وہ صحیح حدیثوں کی روشنی میں حضرت جبرئیل ؑ کی ان سب مختلف صورتوں کا ذکر کرتا ہے۔

قرآن مجید حضرت محمد ؐ کی تصنیف نہیں ہے۔

قرآن مجید کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف نہ ہونا ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے، لیکن اس کے برعکس مفسد مستشرقین کا یہ دعویٰ ہے کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا اور عظیم الشان کارنامہ قرآن کا اختراع ہے، یا وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ آپ کی جولانیٔ طبع اور باطنی عقل وبصیرت کے فیضان کا ایک مظہر ہے؛ اور وہ خدا کی وحی والہام نہیں ہے۔

اٹین ڈینیہ لکھتا ہے کہ میرے لیے یہ سخت تشویش اور پریشانی کی بات ہے کہ بعض مستشرقین یہ خیال کرتے ہیں کہ آپ ؐ نے غار حرا کی تنہائی اور فرصت میں اپنے مستقبل کا لائحۂ عمل مرتب کیا اور اسی میں آپ ؐ کو قرآن کی تصنیف وتالیف کا خیال ہوا، کیا واقعی انھوں نے ایسا کیا؟ تو پھر کوئی اور کتاب اس سے پہلے کہاں ایسی مرتب ہوئی، خود اس کی ہر سورہ دوسری سورہ سے الگ ہے، اور اس کی سورتیں آپ کو نبوت ملنے کے بعد کسی خاص واقعہ کے سلسلہ میں بیس ۲۰ برس سے زیادہ طویل مدت میں نازل ہوئی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان واقعات کا پہلے سے متوقع رہنا اور ان کا مشاہدہ کر لینا کیسے ممکن تھا،...... درحقیقت قرآن مجید ایک اعجاز ہے جو رسول اللہ صلعم کو بخشا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے انبیاؑ کو وقتی معجزات عطا کیے گئے تھے اور وہ بہت جلد فراموش بھی کر دیے گئے، مگر قرآنی آیات کا معجزہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے، اس کی اثر آفرینی دائمی ہے، اور یہ ہمیشہ موثر رہے گا، بندۂ مومن کے لیے کسی بھی جگہ اور کسی بھی زمانہ میں محض قرآن کی تلاوت کر کے اس معجزہ کا مشاہدہ کر لینا آسان ہے،...... قرآن ہرگز آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف نہیں، یہ اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں کہ اس کی واضح اور روشن آیتوں کو اللہ نے اتار کرایا۔ (محمد ؐ رسول اللہ۔ مصنفہ اٹین ڈینیہ حصہ اول، ص ۱۰۹)

ول ڈیورانٹ سیرت وحدیث کی کتابوں پر اعتماد وانحصار کرنے کے باوجود ضعیف اور موضوع حدیثیں بھی نقل کر دیتا ہے، نیز بعض دور از کار اور جہالت پر مبنی چیزیں تحریر کرنے میں بھی اسے تکلف نہیں ہوتا، جو قاری کو شک وخلجان میں مبتلا کر دیتی ہیں، وہ لکھتا ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر جب چالیس برس کے قریب ہوئی تو آپ کا دینی امور میں انہماک بہت بڑھ گیا، جب رمضان کا مہینہ آتا جو اشہر حرم[1] میں ہے تو آپ تنہا اور کبھی پورے خاندان کے ساتھ حرا پہاڑ پر تشریف لے جاتے، یہ مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھا، یہاں پہونچ کر شب و روز قیام فرماتے اور روزہ، نماز اور غور و فکر میں وقت گذارتے، اسی اثناء میں جب کہ آپ غار میں تنہا معتکف تھے کہ ۶۱۰ء کو شب میں وہ عظیم الشان واقعہ پیش آیا جو پوری اسلامی تاریخ کا محور بنا۔"

پھر ول ڈیورانٹ نے نزول وحی کی ابتداء کے بارہ میں ابن اسحاق کی روایت نقل کی ہے اور اس کے بعد کی چیزیں سیرت ابن ہشام کے حوالہ سے تحریر کی ہیں۔ (قصۃ الحضارۃ ج ۲ ص ۲۴)

نبوت اور وحی کے مسئلہ میں مستشرقین کے مختلف نہج

نبوت اور وحی کے مسئلہ میں مستشرقین کی بحث و تحقیق کا نہج جدا جدا ہے، کبھی ان کا انداز خالص روایتی ہوتا ہے، کبھی وہ اپنی بحث کو دقیق و غامض بنا دیتے ہیں اور کبھی صرف ذاتی احساسات و تاثرات کا اظہار کرتے ہیں، بعض مستشرقین وحی کی صرف ایک ہی صورت پر بحث کرتے ہیں، مثلاً رویائے صادقہ کو مانتے ہیں، مگر حضرت جبرئیلؑ کے وحی لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کو مستبعد قرار دیتے ہیں۔

(الف) بوڈلی کا بیان ہے کہ عمر زیادہ ہونے کے بعد غور و فکر کی وجہ سے آپ کے اندر عصبیت کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، نیز کھانے پینے، چلنے پھرنے اور آزاد زندگی ترک کرنے اور روزے اور شب بیداری کے نتیجہ میں آپ کی صحت متاثر ہوگئی تھی، اس لیے نیم خوابی میں آپ کو عجیب و غریب

---

[1] یہ غلط ہے، اشہر حرم مندرجہ ذیل ہیں: ذوقعدہ، ذوالحجہ، محرم، رجب۔ رمضان ان میں شامل نہیں، سیرت ابن ہشام میں ہے کہ آپ ہر سال ایک مہینہ غار حرا میں مقیم رہتے، ابن ہشام نے رمضان کے مہینہ کی صراحت نہیں کی ہے۔

خواب دکھائی دیتے تھے، جو غنودگی اور غفلت کی کیفیت زائل ہونے کے بعد آپ کو اچھی طرح یاد آجاتے تھے۔" یہ بیان کرنے کے بعد وہ آپ کے پیغام کو اس طرح برحق ثابت کرتا ہے: "کسی یہودی، عیسائی اور بودھ نے اپنی نگاہ کے سامنے اپنے دین کو اس قدر معجزانہ سرعت کے ساتھ نشو و نما پاتے نہیں دیکھا ہوگا، اور نہ کسی دوسرے دینی رہنما کو اپنی زندگی ہی میں اپنی دعوت کی کامیابی کو اس طرح دیکھنا نصیب ہوا ہوگا جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا، بوڈلی یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری رسول اور اسلام اس کا آخری دین ہے،

"..... آپ کا اصلی امتیاز وحی ہے، آپ جو کچھ کرتے تھے اس کی ہدایت آپ کو خدا کی طرف سے ہوتی تھی، آپ نہ فرشتہ تھے اور نہ آپ کی حیثیت عیسائیوں کے قدیس (سینٹ) کی طرح تھی، آپ کی زندگی طرز رہائش کے اعتبار سے دوسرے لوگوں سے ممتاز اور مختلف نہیں نظر آئے گی، آپ کے نام کا سکہ نہیں چلتا تھا، اور نہ آپ کے پاس دولت و ثروت کی فراوانی تھی۔

(ب) فلپ ہٹی کے نزدیک وحی خواب اور فکر کا نام ہے، مگر آخر میں وہ اسے حضرت جبرئیلؑ کی آواز بتاتا ہے، چنانچہ لکھتا ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پے در پے ایسے اسباب جمع ہوگئے تھے جن کی وجہ سے فکر و تامل آپ کی عادت ثانیہ بن گئی تھی، اسی غرض سے آپ ایک غار میں تشریف لے جاتے تھے جو مکہ کے شمال میں دو فرسنگ کے فاصلہ پر حرا پہاڑ کی بلندی پر تھا، یہاں آپ غور و فکر میں منہمک رہتے، اور وحی و الہام کے بھی منتظر رہتے تھے، چنانچہ اسی غار میں ایک روز آپ نے سونے کی حالت میں یہ آواز سنی:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ۔ (علق: ۱)

پڑھ اپنے اس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔

یہاں تک کہ جب مدنی سورتیں نازل ہونا شروع ہوئیں تب بھی یہی آواز آپ کو سنائی دیتی تھی،

اس کو مسلسل سننے کی وجہ سے آپ سمجھ جاتے تھے کہ یہ حضرت جبرئیلؑ کی آواز ہے" (تاریخ العرب ۱۵۰-۱۵۱)

ہٹی کی کتاب کی ایک فصل کا عنوان ہے: "قرآن خدا کی کتاب ہے" اس میں وہ لکھتا ہے

"قرآن کا مطالعہ کرنے والے جدید علوم کے مبصرین اس کے موجودہ متداول نسخہ کے صحیح ہونے پر متفق ہیں، آج کے سارے قرآنی نسخے تقریباً حضرت زیدؓ کی اصل کے مطابق ہیں، نیز قرآن اپنی موجودہ شکل وصورت میں بعینہ وہی ہے جو حضرت محمدؐ پر نازل ہوا تھا، مسلمانوں کے نزدیک قرآن مجید خدا کا وہ کلام ہے جس کو حضرت جبرئیلؑ نے حضرت محمدؐ کے سامنے پڑھا، اور یہ کلام لوح محفوظ میں تھا جو ساتویں آسمان پر ہے۔

وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت نبوت کے کمالات کی طرح قانون سازی کے اوصاف کی جامع تھی، آپؐ میں امانت ودیانت کی خوبیاں بھی تھیں، اور آپؐ قضا اور قوت فیصلہ کے مالک بھی تھے، آپؐ فوجوں کے سپہ سالار اور ریاست وحکومت کے سربراہ بھی تھے"۔

(ج) ایک مستشرق ڈرمنگھم نے وحی کا ذکر بالکل افسانوی انداز میں کیا ہے، اس نے اپنی کتاب "حیات محمدؐ" میں بہت سی گمراہ کن اور باطل چیزیں جمع کی ہیں اور روایتوں کو ایک دوسرے میں گڈمڈ بھی کیا ہے، اس طرح خود اس کی کتاب میں افسانوی رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ ڈرمنگھم نے وحی اور نبوت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس میں گو بعض باتیں صحیح ہیں، مگر اکثر غلط اور بے بنیاد ہیں، اس نے صحیح اسلامی مآخذ ومصادر اور مستند تاریخی حقائق وواقعات پر انحصار واعتبار کرنے کے بجائے اپنے ذاتی اجتہاد وتاثر پر زیادہ بھروسہ کیا ہے، نیز اس نے صحیح اور غلط حدیثوں کو ایک دوسرے میں خلط ملط کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

"ض"

باب التقریظ والانتقاد

"تحریکِ خلافت"

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

مذکورہ بالا کتاب ترقی اردو بورڈ نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے، یہ جناب قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کی قلمی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، وہ بستی کے نہ صرف ایک نامور وکیل تھے، بلکہ اپنی دینی حمیت کی وجہ سے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، اپنی ایمانی حرارت سے انجمن تعلیمات دین کی تنظیم کے ذریعہ سے اس ریاست میں دینی مکاتب کا جو جال بچھوا دیا، وہ ان کی زندگی کا بڑا روشن کارنامہ ہے، اس کام کے سلسلہ میں حکومت سے بھی بڑی دلیری کے ساتھ قانونی ٹکر لی اور اپنی بات منوائی، وہ شروع سے کانگریس کے وفادار اور گاندھی جی کے پرستار رہے، اس لیے ان کا شمار نیشنلسٹ مسلمانوں میں ہوتا رہا، جن کی خوبی یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان چاہے جتنی بھی پولٹیکل کروٹ لیتے رہیں، وہ ہر حال میں کانگریس کی ہمنوائی کرکے اپنے کردار کی پختگی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں، اس پختگی اور وضعداری کا نمونہ جناب قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم بھی تھے، ۱۹۴۷ء کے بعد نیشنلسٹ مسلمانوں نے اپنی خدمات کا صلہ مختلف طریقوں سے پایا، مگر قاضی صاحب مرحوم نے اپنے اعلیٰ کردار کا یہ بھی ثبوت دیا کہ حکومت سے اپنی خدمت اور قربانی کا صلہ وصول کرنا اپنی خودداری اور شان کے خلاف تصور کیا، اس حیثیت سے بھی وہ اپنے معاصروں اور ہم چشموں میں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

انھوں نے اپنی مذکورۂ بالا کتاب خالص نیشنلسٹ مسلمان بن کر لکھی ہے، وہ شروع میں ایک صحافی تھے، پھر وکالت شروع کی تو آخر وقت تک وکیل ہی رہے، اس لیے اس کتاب میں ایک صحافی اور ایک وکیل ہی کا استدلالی رنگ پیدا ہو گیا ہے، جس سے تصنیفی رنگ ماند پڑ گیا ہے، تصنیفی تقاضا تو یہ تھا کہ کتاب میں پہلے خلافت کی تاریخ لکھ کر اس کی نوعیت اور اہمیت بتائی جاتی، پھر ترکی میں خلافت کے خطرہ میں پڑ جانے سے ہندوستان میں جب تحریک چلی تو اس سلسلہ میں جو خلافت کانفرنس قائم ہوئی اس کی ابتدا کب ہوئی، اس کے خاتمہ تک اس کے کتنے کل ہند اور کتنے صوبائی اجلاس ہوئے، ان اجلاسوں کے کون کون صدر ہوتے گئے، انھوں نے اپنے صدارتی خطبوں میں کن کن طریقوں سے مسلمانوں کو اس تحریک میں حصہ لینے کے لیے ابھارا، ان اجلاسوں میں کیا کیا تجویزیں منظور ہوتی رہیں، ان کو عمل میں کس طرح لایا گیا، عمل میں لانے کے سلسلہ میں مسلمانوں نے کیا کیا قربانیاں دیں، کتنے جیل گئے، کتنے گولی کا نشانہ بنے، اس تحریک کا تال میل تحریک ترک موالات سے کیوں اور کن کن طریقوں سے ہوتا رہا، اور پھر اس کی ناکامی کے اسباب کیا ہوتے، ان سب کی پوری تفصیلات لکھی جاتیں تو کتاب مکمل سمجھی جاتی۔

فاضل مؤلف نے ان سب کی طرف تھوڑے تھوڑے اشارے ضرور کیے ہیں، لیکن ان کے مطالعہ سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ اصل موضوع پر کتاب لکھ رہے ہیں یا اس سے ہٹ کر اپنے خاص خیالات کا اظہار کر رہے ہیں، پہلے باب میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک خطبۂ صدارت سے خلافت کی شرعی حیثیت ضرور بتائی گئی ہے، لیکن اس کی تاریخ نہیں لکھی گئی، حالانکہ فاضل مؤلف خود لکھتے ہیں کہ یہ کتاب مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ماضی اور حال کی تاریخ اور دونوں کی قدروں کا جائزہ نہ لیا جائے (ص ۱۹) دوسرے باب میں اس جائزہ کی کچھ جھلکیاں ضرور ہیں لیکن اس میں تاریخی رنگ نہیں، خلافت کی شرعی حیثیت دکھا کر یہ چونکا دینے والا بیان ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے:

"تحریک خلافت کی قیادت ابتدا سے انتہا تک مہاتما گاندھی کے ہاتھوں میں رہی، بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح اور بجا ہوگا کہ اگر مہاتما گاندھی اس تحریک میں پوری قوت کے ساتھ شامل ہو کر اس کا کل بار اپنے کندھوں پر نہ لے لیتے تو تحریک خلافت میں جو زور پیدا ہوا، وہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ (ص ۱۷)

یہ لکھ کر اور اسی کو بار بار دہرا کر فاضل مصنف نے اپنی اس کتاب کو متنازعہ فیہ بنا دیا ہے اور اپنے ناظرین کو بہت کچھ کہنے کا موقع دے دیا ہے، وہ لکھتے ہیں، اور بالکل صحیح لکھتے ہیں کہ خلافت کا مسئلہ مذہبی تھا، تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مہاتما گاندھی نے مسلمانوں کے ایک مذہبی مسئلہ کا کل بار اپنے کندھوں پر کیوں لے لیا، اگر انھوں نے مسلمانوں کی بے چینی سے متاثر ہو کر ان کے ایک مذہبی مسئلہ کی قیادت قبول کر لی تو پھر تحریک خلافت کے بعد مسلمانوں کے کسی مذہبی مسئلہ کی قیادت کرتے ہوئے تو نظر نہیں آتے، اور نہ پھر مسلمانوں نے اپنے کسی مذہبی مسئلہ میں ان کی قیادت قبول کی۔

گاندھی جی کو خلافت تحریک کا مرد میدان (ص ۲۷) بتانا فاضل مصنف کی اس بے پناہ عقیدت کا خراج ہے جو ان کو گاندھی جی کی ذات سے تھی، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس آزمائش میں ان کے محض معاون، حامی، ہمدرد، ہمنوا اور دوست بنے رہے، اس میں ان کے مصالح بھی تھے، وہ سچائی کے پرستار تھے، ان کے دل میں جو بات ہوتی وہ اپنے ہفتہ وار ینگ انڈیا میں برابر لکھتے رہتے، اسی لیے تحریک خلافت پر ینگ انڈیا میں لکھا کہ مسلمانوں کا مطالبہ صحیح ہے، ہندوؤں کا اس کی پوری پوری حمایت نہ کرنا برادری کی ایک بزدلانہ عہد شکنی ہوگی، پھر وہ مسلمانوں کی حمایت سے کئی رعایتوں کے حق کو بالکل تلف کر دیں گے، اس لیے پبلک کے ایک خدمت گذار ہونے کی حیثیت سے میں ہرگز اس پوزیشن کا مستحق نہ ہوں گا جس کا میں دعویٰ کرتا ہوں (ینگ انڈیا ۶ر اپریل ۱۹۲۰ء) جہاں اس کی حمایت کرنے میں طرح طرح کے دلائل دیے، وہاں ہندوؤں کی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے یہ بھی لکھا کہ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ میرے اور مولانا محمد علی کے

نزدیک مسئلہ خلافت مرکزی اہمیت رکھتا ہے، مولانا محمد علی کا تو یہ مذہب ہے، میرے نزدیک اس کی مرکزی حیثیت اس وجہ سے ہے کہ خلافت کی خاطر میں اپنی جان پیش کر کے گائے کو جو میرا دھرم ہے، مسلمانوں کی چھری سے محفوظ رکھ سکوں گا۔" (ینگ انڈیا۔ ۱۱ رمئی ۱۹۲۰ء) اس مقصد میں گاندھی جی کو کامیابی بھی ہوئی۔ ان کا خود بیان ہے کہ ہمارے مسلمان ہموطن اس سلسلہ میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کام کر رہے ہیں، مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا وہ اعلان دہرانا چاہتا ہوں جس میں انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ جب تک ان کے مقلدین گائے کی حفاظت کے لیے تیار نہ ہو جائیں گے، وہ مسئلۂ خلافت میں برادرانِ وطن کی کسی پیش کردہ امداد کو قبول نہ کریں گے، انھوں نے اس بات کی پابندی کی ہے، وہ گائے کے متعلق ہمدردانہ اور سودمندانہ نوعیت کی تلقین کر کے ایک موافق فضا پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، حکیم اجمل خاں نے مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے ہر قسم کی مخالفت کے باوجود یہ تجویز منظور کرائی ہے کہ کسی تہوار کے موقع پر گائیں ذبح نہ کی جائیں گی، علی برادران نے اپنے گھر میں گائے کا گوشت منگوانا بند کر دیا ہے، اس میں ان شریف دل مسلمانوں کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے کچھ کہے بغیر یہ طرز اختیار کیا، ہمیں چاہیے کہ اس اہم مسئلہ کو ان پر چھوڑ دیں کہ وہ اپنے طریقے پر اس کو حل کر لیں، ہندو بھائیوں کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ معاوضہ کا خیال کیے بغیر فیاضانہ طور پر مسلمانوں کی مدد کریں، نتیجہ میں گائے کی حفاظت خود بخود ہو جائے گی، اسلام ایک شریف مذہب ہے، اس لیے اس پر اور اس کے پیروؤں پر اعتبار کرو۔ (ینگ انڈیا۔ ۴ر اگست ۱۹۲۰ء)

گاندھی جی کے ان صداقت آمیز بیانات کو پڑھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ تحریک خلافت کے ساتھ کیوں ہوئے، اسی روشنی میں ان کی معاونت اور حمایت کا مطالعہ کرنا تھا۔

فاضل مؤلف کسی لحاظ سے اپنے ناظرین کو یہ یقین دلانا نہیں چاہتے تھے کہ مولانا محمد علی اس تحریک کے اصلی روحِ رواں تھے، حالانکہ ان کو اس کا اقرار ہے کہ "مولانا محمد علی نے اپنے بے مثال دردِ دل کے

ماتحت اپنی صحت کو نظر انداز کر کے تحریک خلافت کا بوجھ اپنے کندھوں پر لیا۔" (ص ۳۸) وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مولانا محمد علی چوائس آف دی ٹرکس لکھنے پر جب نظر بند ہوئے تو وہ مسلمانوں کے ہیرو بن گئے، ان کی شہرت و مقبولیت میں چار چاند لگ گئے، ڈیڑھ لاکھ تار وائسرائے اور وزیر ہند کو بھیجے گئے، جس میں ان کی نظر بندی منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ (ص ۷۱) وہ اس حقیقت کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ گاندھی جی، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا، لوگوں نے آنکھیں بچھائیں، پبلک ٹوٹ پڑی، گاندھی جی پانچ سات منٹ سے زیادہ تقریر نہ کرتے تھے، مگر مولانا محمد علی دو ڈھائی گھنٹے سے کم وقت نہ لیتے تھے، روتے اور رلاتے تھے، موقع بموقع قرآن کی آیتیں پڑھ کر ایسی شرح کرتے تھے کہ ان پر مولانا کا خطاب پوری طرح صادق آتا تھا (ص ۷۱) ان کے ناظرین ان کی کتاب میں یہ بھی پڑھتے ہیں کہ دسمبر ۱۹۱۹ء میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی بیتول جیل سے رہا ہوئے، اسی وقت امرتسر میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا اجلاس مقرر تھا، اور اسی کے ساتھ خلافت کانفرنس بھی ہو رہی تھی، دونوں بھائیوں کو کانگریس کی طرف سے دعوت دی گئی، دونوں بھائی براہ راست جلسہ گاہ میں پہونچے، مولانا محمد علی نے ایک طویل تقریر کی جو بے حد جذباتی اور پر اثر تھی، بقول مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا محمد علی کی شرکت گویا تمام مسلمانان ہند کی شرکت تھی، کیونکہ وہ اپنے علم و فضیلت، اسلام نوازی، جرأت حق گوئی و بے باکی، عظیم ایثار و قربانی کی وجہ سے ہندوستان کے مسلم لیڈر بن چکے تھے، رہائی کے بعد وہ جن اسٹیشنوں سے گذرے وہاں ان کا عظیم الشان استقبال کیا گیا۔" (ص ۱۰۲) اسی کتاب میں یہ بھی ہے کہ "مولانا محمد علی کی علمیت و فضیلت، ان کا انداز خطابت، ان کے الفاظ کی شوکت اور سب سے زیادہ ان کے دل کا سوز و گداز، ان سب نے مل کر عوام و خواص کے دلوں میں ایک انتقامی جذبہ بھر دیا اور انھوں نے سمجھا کہ ایک گرتی ہوئی دیوار آزادی ہندوستان سے پھر سنبھل سکتی ہے۔" (ص ۱۵۹) اسی کتاب میں فاضل مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ (ص ۱۹۰-۱۸۹)

کراچی کے مقدمہ کے فیصلے کے بعد مولانا محمد علی اور زیادہ ہیرو بن گئے، اگرچہ سزا تو بہت لوگوں کو ہوئی مگر زیادہ ذکر مولانا محمد علی کا تھا، کیونکہ وہ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے لیڈر (یعنی مسلمہ لیڈر) تھے،"...... گھر گھر یہ صدا پہونچ چکی تھی ؎

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہیں شوکت علی بھی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اور ایک دل گداز نظم بھی پڑھی جاتی جو اس طرح شروع ہوتی :

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی — ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

کراچی کی عدالت میں علی برادران کو جو سزا دی گئی اس کے ردعمل میں فاضل مولف کا بیان ہے کہ "علی برادران کی وحشیانہ سزایابی کے مقابلہ کا عزم آسمان سے باتیں کرنے لگا" (ص ۲۲۶)

یہ ساری باتیں لکھی ضرور گئی ہیں، مگر ان کا ذکر اجمالی اور ضمنی طور پہ آیا ہے، ان کو نمایاں طور پر کتاب میں پڑھنے کے بجائے اس کے اور واقعات کے انبار میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنا پڑتا ہے، اگر ان ہی کی پوری تفصیلات فراخدلی سے لکھ دی جاتیں تو یہی تحریک خلافت کی جاندار اور باوقار تاریخ بن جاتی، جان تو مولانا محمد علی خلافت پہ دیں، مگر ان کو اس کا مردِ میدان اور روحِ رواں بنانے سے احتراز کیا جائے، یہ تسلیم کہ مولانا محمد علی تحریک خلافت کو کامیاب بنانے کے بجائے شکستوں سے معمور رہے لیکن اپنے بعض بزرگوں کے کچھ الفاظ کا سہارا لے کر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انھوں نے جس طرح ایک ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لہو، مگر دہکتی ہوئی روح اور دمکتے ہوئے چہرے سے یہ لڑائی لڑی یا جس طرح ان کی پُر درد آواز اسلام کے اس قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوئی، یا جس طرح ان کا بے قرار دل مسلمانوں کی اس مصیبت کے وقت بے تاب ہوا، اور دوسروں کو بھی بے قرار کیا، یا جس طرح اس رزم میں ان کی آتشیں زبان تیغ براں بن کر چمکی یا جس طرح اس مہم میں ایک فقیر بے نوا ہو کر

پیکر شاہانہ میں نظر آئے، یا جس طرح شمعِ دیں پر پروانہ وار گرے، وہی دراصل تحریک خلافت کی تاریخ ہے۔

مولانا محمد علی بقول مصنف جذباتی قسم کے آدمی تھے، گاندھی جی سے ان کو محبت ہوئی تو اپنی تحریک خلافت ان کے سپرد کردی اور ایک موقع پر تو یہاں تک کہہ گئے کہ رسول اللہؐ کے بعد میرے اوپر گاندھی جی کا حکم نافذ ہے، (ص ۸۰) اور خود گاندھی جی ان سے اور مولانا شوکت علی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ کہا کرتے کہ میں نے اپنے آپ کو علی برادران کی گود میں ڈال دیا ہے، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ سچے اور خدا ترس لوگ ہیں (ص ۲۳۰) ان بیانات سے ظاہر ہے کہ دونوں طرف سے تعاون کی آگ برابر لگی ہوئی تھی، دونوں ایک دوسرے کا تعاون چاہتے تھے، مگر دونوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ قائد تو ہو سکتے تھے لیکن مقتدی ہونا پسند نہیں کرتے تھے، مساویانہ حیثیت سے ایک دوسرے کا ساتھ دے سکتے تھے، اور اس زمانہ میں دیا، مولانا محمد علی کے بیان کے مطابق انھوں نے دس سال تک گاندھی جی کے ساتھ گھل مل کر کام کیا، تحریک خلافت میں مسلمانوں کے جو جذبات ابھرے ان سے فائدہ اٹھا کر گاندھی جی نے ان کے جذبات کو تحریک آزادی کے لیے استعمال کرنا چاہا، خود فاضل مؤلف نے لکھا ہے کہ لوکمانیہ تلک کا خیال تھا کہ پنجاب کے خونیں واقعات اور تحریک خلافت سے جو عظیم جذبات ابھرے ان کا استعمال ماٹیگو چیمسفورڈ ریفارم میں کیا جائے (ص ۱۶۱) گاندھی جی نے اس کا استعمال ماٹیگو چیمسفورڈ کے بجائے آزادی کی جنگ میں کیا اور پھر مولانا محمد علی نے گاندھی جی کی حمایت اس لیے کی کہ ان کے خیال میں جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے خلافت کی گرتی ہوئی دیوار آزادیِ ہندوستان سے پھر سنبھل سکتی ہے (ص ۱۶۹)

اس طرح گاندھی جی نے مولانا محمد علی اور مولانا محمد علی نے گاندھی جی کو استعمال کیا، اب سوال یہ ہے کہ دونوں میں سے کس کو زیادہ فائدہ پہونچا؟ اس کتاب میں ہے کہ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی جہاں تمام گاندھی کے ساتھ دورے کر رہے تھے، ہر جگہ عظیم الشان جلسے ہوتے تھے، آدمیوں کی کثرت کی کوئی انتہا نہ تھی، مولانا محمد علی کی تقریروں سے بڑا جوش و خروش پیدا ہوتا، گاندھی جی کی عظمت آسمان کو

چھوڑ رہی تھی (ص ۱۸) کیا گاندھی جی کی اس عظمت کو آسمان تک پہونچانے میں مولانا محمد علی معاون نہیں ہوئے؟ ضرور ہوئے، مسلمانوں میں گاندھی جی کی مقبولیت علی برادران ہی کی وجہ سے ہوئی، اس وقت علی برادران کی جو محبوبیت مسلمانوں میں تھی وہ کسی ہندو لیڈر کی ہندوؤں میں نہ تھی، اور جتنی زبردست تنظیم خلافت کانفرنس کی تھی، وہ کانگریس کی نہ تھی، گو یہ پرانی ضرور تھی، خود مصنف کو اس وقت کے مولانا محمد علی کی مذہبیت، دینداری، علم و فضل، انگریزی اور اردو کی بے مثال انشاء پردازی، فن شعر گوئی کی مہارت، خطابت کے زور، خلوص و دیانت داری کا اعتراف ہے، اور وہ لکھتے ہیں کہ مولانا محمد علی کا مذہبی جوش، ان کی شخصیت، ان کے اصرار کا طریقہ اور ان کے منطقی دلائل سب کو مبہوت کر دیتے (ص ۲۵۷) ان کے لیے قوم آنکھیں بچھاتی تھی، چراغاں کرتی تھی (ص ۲۶۲) گاندھی جی کو مولانا محمد علی کے ان محاسن سے ضرور فائدہ پہونچا، اور جب ان کی عظمت آسمان کو چھونے لگی تو پھر ان کو مولانا محمد علی کی ضرورت نہیں رہی، وہ ان سے دور ہو گئے، مولانا محمد علی نے بھی گاندھی جی کی حمایت کو تحریک خلافت میں اچھی طرح استعمال کیا، مگر جب ان کی یہ تحریک ناکام ہو گئی تو پھر وہ بھی گاندھی جی سے دور ہو گئے، جس کے بعد گاندھی جی کی قیادت مسلمانوں میں اتنی موثر نہیں رہی جتنی تحریک خلافت میں علی برادران کی معیت میں تھی، حالانکہ نیشنلسٹ مسلمانوں کی بہت سی جلیل القدر شخصیتیں ان کی ہمنوائی کرتی رہیں۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی کتاب 'باپو کے قدموں میں' تحریک خلافت پر جو تبصرہ کیا ہے اس کے کچھ اقتباسات یہ ہیں:

"ہندوؤں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ مسلمانوں کو خلافت کے معاملہ میں، دوسرے کر گاندھی جی اور ان کی لیڈری میں کام کرنے والے دوسرے نیتاؤں نے زبردست غلطی کی، ان لوگوں کی وجہ سے مسلمانوں میں اتنی بیداری پیدا ہوئی، اور اس بیداری کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ وہ لگے

زیادتی کرنے لگے۔"

اس سلسلہ میں کچھ اور لکھنے کے بعد ڈاکٹر راجندر پرشاد لکھتے ہیں:

"علی برادران کا کہنا تھا کہ کانگریس اور ہندوؤں کی وجہ سے مسلمانوں میں بیداری نہیں پیدا ہوئی بلکہ اس بیداری کا سبب یہ تھا کہ ان کے مذہبی عقیدوں پر برٹش گورنمنٹ نے اپنے اعتبار سے گہری چوٹ دی تھی، اگر کانگریس یا گاندھی جی ان کا ساتھ نہ دیتے تو بھی وہ اس مسئلہ کو لے کر برٹش گورنمنٹ سے ضرور لڑتے، چاہے اس لڑائی کا طریقہ کوئی دوسرا ہی کیوں نہ ہوتا، اور اس کا نتیجہ خواہ کچھ بھی ہوتا، کانگریس اور ہندوؤں نے جو مدد کی تھی اس کے وہ شکر گذار تھے لیکن ہندوؤں اور کانگریس کو بھی یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مسلمانوں کے آجانے سے ان کی بھی طاقت کتنی بڑھ گئی اور اب وہ اس قابل ہوئے کہ برٹش گورنمنٹ سے مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ (باپو کے قدموں میں اردو ترجمہ، ص ۳۰۵-۳۴۴)

اس تبصرہ کی روشنی میں اگر یہ کتاب قلمبند کی جاتی تو اس کی نوعیت کچھ اور ہوتی، مگر مولانا محمد علی کے مصنف محبوب قائد گاندھی جی سے دور ہو گئے، تو وہ ان سے ایسے بدظن ہوئے کہ ضمنی اور اجمالی طور پر ان کی تعریف کرنے کے باوجود ان کو اپنی اس کتاب میں ہر طرح گھائل کرنے کی بھی کوشش کی ہے، وہ تو یہ بھی باور کرانا چاہتے ہیں کہ محمد علی کا ماضی حکومت برطانیہ سے وفادارانہ تھا (ص ۷۰) گو ایک جگہ یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ انھوں نے حکومت کی وفاداری کو اپنی بے مثال قربانی اور بے نظیر جرأت مردانگی اور اسلامی جذبہ سے دھو ڈالا (ص ۱۷۳) مولانا محمد علی خلافت کانفرنس کی طرف سے جو وفد انگلستان لے گئے اور وہاں برطانوی حکومت کے فرعونوں کے سامنے جس جرأت، بے باکی اور مذہبی حمیت کے ساتھ تقریریں کیں، اس کی مثال ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت میں اب تک نہیں مل سکتی، خود فاضل مصنف کا بیان ہے کہ انھوں نے رئیس وفد کی کارکردگی کا حق ادا کر دیا، یہ انہی کا حصہ تھا، اور انھوں نے برطانوی وزراء اور برطانوی پبلک، دول متحدہ کے مدبرین، فرانس کی حکومت کے

سربراہ، عراق و عرب کے لیڈروں، امیر فیصل وغیرہ سب کو ہلا ڈالا (ص ۱۲۵) مگر ان کے اس کارنامہ پر یہ لکھ کر پانی پھیر دیا گیا ہے کہ مولانا محمد علی جیسا کہ ان کی عادت تھی اپنی سی کہتے گئے، ان کی یہ عادت تمام عمر قائم رہی۔ (ص ۱۲۱) پھر لکھا ہے کہ وفد سے واپسی کے بعد ان سے وفد کے اخراجات کا حساب مانگا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ خدا کو بروز قیامت حساب دوں گا، اس پر شریروں نے کہا: اگر وہ نہ لے اور بے حساب آپ کو بخش دے؟ حساب ہمیں دیجیے، اس کے بعد فاضل مصنف رقمطراز ہیں کہ اس سلسلہ میں جو کیچڑ اچھلا، اس کے مولانا محمد علی خود ذمہ دار تھے، ان کے اندر دو بڑی کمزوریاں تھیں، ایک تو یہ کہ وہ اپنی زبان پر قابو نہیں رکھتے، جو دل میں آتا کہہ دیتے جس سے لوگوں کے دلوں پر چوٹ لگتی تھی، مولانا محمد علی پر بہت لوگوں نے لکھا ہے اور وہ اسے ان کی خوبی تصور کرتے ہیں، اس سے ان کی صاف دلی اور بے باکی کے نتائج نکالتے ہیں، مجھے اس سے بالکل اتفاق نہیں ...... دوسری کمزوری مولانا محمد علی میں یہ تھی کہ وہ درگذر سے کام لینا تو جانتے ہی نہ تھے جہاں ان کے خلاف کوئی بات آتی پھر ان کا قلم تھا اور ان کی شوخ نگاریاں (ص ۱۲۴ - ۱۲۳)

کراچی کی خلافت کانفرنس کا اجلاس مولانا محمد علی کی صدارت میں ہوا، اس میں مولانا نے پورے زور خطابت کو کام میں لاتے ہوئے اور آیات و احادیث کا حوالہ دیتے ہوئے بقول مصنف انتہائی گرم اور طویل تقریر کی اور صرف برطانوی فوج کی ملازمت ہی کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ تمام سامعین کو زبردست ترغیب دی کہ وہ فوجیوں کی ملازمت سے مستعفی ہونے کے سلسلہ میں پوری کوشش کریں۔ (ص ۱۸۳) کتاب میں اس کا اعتراف بھی کیا گیا ہے کہ اس تجویز سے انگریزی حکومت کی چولیں ہل گئیں (ص ۱۸۴) مگر اس سلسلہ میں بھی مولانا محمد علی کو یہ لکھ کر مجروح کیا گیا ہے کہ یہ تجویز منجانب صدر پیش ہوئی، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ صدر جلسہ مولانا محمد علی اس پر تقریر کرنے کے لیے بے تاب رہے ہوں گے، (ص ۱۸۳) ایسی احتمالی کے استعمال کی کیا ضرورت تھی۔

کراچی کے مقدمہ کے جج کے سامنے مولانا محمد علی نے جو بحث کی اس کو پڑھ کر ہر مسلمان کا ایمان تازہ ہو سکتا ہے، مگر اس پر یہ تبصرہ لکھ کر اس کی ساری اہمیت زائل کر دی گئی ہے:

"سیشن کا مقدمہ شروع ہوا تو بقیہ لوگوں نے خاموشی اختیار کی، مگر مولانا محمد علی الجھ گئے، زور دے کر کہنا شروع کیا کہ اگر خدا کا قانون برطانوی حکومت کے قانون سے متصادم ہوگا تو میں خدا کا فرماں بردار ہوں گا، برطانوی قانون کو نظر انداز کروں گا، جو شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے اس کو قرآن کے حکم کا پابند ہونا چاہیے اگر وہ قرآن کی کسی آیت کی بھی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ' ایک پورا وعظ دے ڈالا جو قطعی بے موقع اور غیر متعلق بات تھی۔ (ص ۱۸۶)

مولانا محمد علی کے انتہائی استہزا کی مثال یہ بھی ہے:

"مولانا محمد علی نے...... ایک تقریر کے دوران کہہ دیا کہ اگر ہندو میری بیوی یا میری ماں کی عصمت دری کریں تب بھی میں ہندوؤں سے نہیں لڑوں گا، اس جملے سے مسلمانوں میں بڑا اضطراب پیدا ہوا، جلسہ ختم ہونے کے بعد میں تھوڑی دیر ٹھہر گیا، دیکھا کہ حکیم اجمل خاں مولانا محمد علی سے کہہ رہے ہیں کہ جب یہ طے ہو گیا تھا کہ کوئی تقریر نہیں کرے گا، تو آپ نے کیوں تقریر کی؟ مولانا محمد علی جھلا گئے اور غصہ سے بھری ہوئی آواز میں کہا: میں ایسا ذلیل نہیں ہوں کہ آپ مجھے ڈانٹیں، میں یہ جواب سن کر سکتہ میں رہ گیا، عصر کی نماز کے لیے مولانا عرفان' مولانا عبدالحلیم، مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ جمعیۃ علماء کے دفتر کے قریب ہی کی مسجد میں گئے...... وہاں مولانا عبدالحلیم نے مولانا مدنی سے کہا کہ مولانا محمد علی نے اپنی بیوی کی عصمت دری کے بارے میں تو خیر لیکن ماں کے لیے کیوں کہا، کیونکہ وہ تو ہم سب کی بھی ماں ہیں مولانا مدنی بھی مسکرائے اور کہا کہ ان کو بھی تو آپ کہہ دیجیے کہ ہماری بہن ہیں" (ص ۲۵۱)

اوپر کے مختلف بیانات میں اس شخص کا مذاق اڑایا گیا ہے جس کے متعلق فاضل مصنف کا خود بیان ہے کہ اس نے اپنے بے مثال دردِ دل کے تحت اپنی صحت کو نظر انداز کر کے تحریکِ خلافت کا بوجھ اپنے کندھوں پر لیا اور جو ہندوستان کے مسلمانوں کا ہیرو بھی بنا جس کے لیے لوگ آنکھیں بھی بچھاتے چراغاں بھی کرتے اور جو مسلمانوں کے

مسئلہ پر بولتا تو خود بھی روتا اور دوسروں کو بھی رلاتا۔

ممکن ہے کہ یہ کہہ کر مدافعت کی جائے کہ یہ سارے بیانات معروضیت پر مبنی ہیں، مگر یہ معروضی انداز ان لیڈروں کے ساتھ اختیار نہیں کیا گیا جن کو مصنف نے اپنا محبوب بنا لیا ہے، عام مسلمانوں کو نیشنلسٹ مسلمانوں سے یہ شکایت رہی ہے کہ وہ جس بے تکلفی، بے باکی اور ان کے خیال میں سچائی سے مسلمان اور مسلمان لیڈروں کی تنقید اور تنقیص کرتے ہیں، برادران وطن اور ان کے لیڈروں پر نہیں کرتے۔ اس کتاب میں مولانا محمد علی کو جس طرح زخمی کیا گیا ہے اس کے علاوہ بھی کچھ مثالیں ملیں گی، مثلاً اتحاد کانفرنس کی جو تفصیلات لکھی گئی ہیں (ص ۲۵۲) ان میں پنڈت مدن موہن مالوی کو مفتی کفایت اللہ سے اونچا دکھانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس ملاپ کانفرنس میں جو معاہدہ ہوا اس کو توڑنے کی ذمہ داری بھی مسلمانوں پر یہ لکھ کر عائد کر دی گئی ہے کہ

"مفتی صاحب پہلے تو اڑے مگر اڑنے کی گنجائش کہاں تھی، آخر کار مان گئے اور پنڈت مالوی جی کی تجویز پاس ہو گئی، افسوس کہ بعد میں کوئی اس پر قائم نہ رہا، شاید اس عہد کو توڑنے کی پہل مسلمانوں ہی نے کی" (ص ۱۶۲)

شاید کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ فاضل مصنف کو پورے طور پر یقین نہ تھا کہ مسلمانوں نے اس عہد کو توڑنے میں پہل کی، پھر اس اظہار حق کی ضرورت کیا تھی۔

پرنس آف ویلیز کی آمد پر بمبئی میں جو بلوے ہوئے اس میں گاندھی جی کا حسب ذیل بیان نقل کر کے مسلمانوں ہی کو مورد الزام ٹھہرایا گیا ہے:

"میرا یقین ہے کہ گذشتہ دو دن کے بلووں میں مسلمانوں نے بیش از بیش حصہ لیا، اس سے مجھ کو سخت صدمہ ہوا" (ص ۲۳)

پنڈت مدن موہن مالوی کے لیے مصنف کے دل میں بڑا نرم گوشہ رہا، ان کو خراج عقیدت اس طرح پیش کیا ہے:

"پنڈت مدن موہن مالوی ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے، ان کا دامن ہر طرح کی آلودگیوں سے پاک تھا، ہندو دھرم کے ایک سچے اور باوقار پیرو ہوتے ہوئے ان پر تعصب یا تنگ نظری کا الزام کبھی عائد نہیں ہوا ..... ان کے خیالات انتہا پسندانہ نہیں رہے، وہ اپنی انتہا پسندی کی مخالفت پر بھی کبھی آمادہ نہیں ہوئے" (ص ۲۴۶)

واضح رہے کہ پنڈت مدن موہن مالوی ہندو مہا سبھا کے بانیوں میں سے تھے، اور انھوں نے ہندو مہا سبھا کی تاسیس کے جلسہ کی صدارت کی اور سنگٹھن قائم کرایا، ان کی سیاسی رائے سے مولانا محمد علی ہمیشہ اختلاف کرتے رہے۔

فاضل مؤلف کو مولانا محمد علی سے یہ شکایت رہی کہ وہ اپنی سی کہتے رہتے تھے (ص ۱۲۱) وہ وعظ دے ڈالتے تھے جو قطعی بے موقع اور غیر متعلق ہوتا (ص ۱۸۶) مؤلف کی اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت بعض اوقات یہی خیال ہوتا ہے کہ وہ اپنی سی کہتے جا رہے ہیں، اور کہیں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ وعظ دے ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں، بعض اوقات تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ ہم تحریک خلافت یا ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ پڑھ رہے ہیں، یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ اس میں کون سی بات تحریک خلافت سے متعلق ہے اور کون قطعی غیر متعلق ہے، مسز بسنٹ، لوکمانیہ تلک، اندرا گاندھی، مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی، الہلال کے مضمون نگار نیم شبی کا تعلق کتاب کے اصل موضوع سے کیا ہے، اور جن کا تعلق تحریک خلافت سے رہا، ان میں بہت سے کتاب میں زیادہ متحرک نظر نہیں آتے، مثلاً بقول مصنف پہلی خلافت کانفرنس دہلی میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی صدارت میں ہوئی (ص ۱۲۷) وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مولانا عبدالباری اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے مسلمہ قائد تھے اور عوام ہوں یا خواص، انگریزی تعلیم یافتہ ہوں یا علماء، سب میں مولانا کا وقار تھا، ..... (ص ۱۳۴)

مگر مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا ذکر اس کتاب میں ایسا ضمنی طور پر آیا ہے کہ کہیں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ اس وقت مسلمانوں کے مسلمہ قائد تھے، غیر متعلق باتوں کا تو انبار کتاب میں لگا ہوا ہے جن میں سر سید احمد خان کا بھی ذکر آ گیا ہے اور جب وہ سر سید احمد خان، علی گڑھ کالج اور علی گڑھ تحریک کے متعلق لکھتے نظر آتے ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ ان کے کچھ دبے ہوئے جذبات تھے جو اس کتاب کے لکھتے وقت ابھر آئے، تحریک خلافت سے ان کا تعلق کیا ہے، پھر ان کی تحریروں میں سر سید احمد خان جس طرح نظر آتے ہیں اس کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ علی گڑھ کے ایک اولڈ بوائے یا ایک خالص نیشنلسٹ مسلم کی تحریر ہے، سر سید کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

"علی گڑھ تحریک سرسید نے چلائی، اس نے برطانیہ کی عظیم وفاداری کا سبق دے کر ان کو حکومت کا پختہ حامی بلکہ غلام بنا دیا تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں ان کی بقا کا انحصار برطانوی حکومت کے قیام میں مضمر ہے۔" (ص ۵۵)

"سرسید نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ سیاست سے بالکل الگ رہیں، اور صرف تعلیم تک اپنے کو محدود رکھیں سیاست کو شجر ممنوعہ قرار دینے میں سرسید کا منشا یہ تھا کہ مسلمان انگریز کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہیں، انگریز ہندوستان سے نہ جائیں، کیونکہ وہی مسلمانوں کا تحفظ کر سکتے ہیں" (ص ۵۸)

"بعض لوگ سرسید کے بعض جستہ جستہ فقروں سے سرسید کو نیشنلسٹ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ تاریخ کو مسخ کرنا ہے ...... انھوں نے ایک عظیم الشان مجمع میں اعلان کیا کہ ہندو اور مسلمان دو علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں اور ہندوستان نمایندہ حکومت کا اہل نہیں۔" (ص ۵۹)

"سرسید انگریزوں کو بہت مہذب، شریف اور ہندوستانیوں کو غیر مہذب اور گنوار سمجھتے تھے، مثلاً وہ انگریزوں کی میز پر چھری کانٹے سے کھانے کی مدح سرائی کرتے ہیں اور ہندوستانیوں کو غیر مہذب اور گنوار سمجھتے تھے۔" (ص ۲۶۹)

"مذہب کے معاملہ میں ان کی مرعوبیت کا یہی عالم تھا کلام پاک کی تفسیر لکھی تو اس میں ملائکہ، اجنّہ، معجزات، معراج جسمانی کا انکار تھا، جبریلؑ کا بھی انکار کیا۔" (ص ۶۰)

سرسید کی شخصیت و سیرت کی اس مرقع آرائی کے ساتھ ساتھ ناظرین فاضل مصنف کی حسب ذیل تحریروں سے بھی محظوظ ہوں:

"سرسید ایک بڑے ذی علم، روشن خیال، ذہین اور عالی دماغ انسان تھے، ان کو اگر عہد آفریں کہا جائے تو بالکل بجا ہوگا۔" (ص ۵۵)

"سرسید ایسے روشن ضمیر اور دانا تھے کہ انھوں نے اس زمانہ میں جب کوئی اس کا خواب بھی

نہ دیکھ سکتا تھا، آج کا منظر دیکھ لیا تھا، اور اس کے لیے اپنی زندگی قربان کر دی تھی۔" (ص ۵۵)

"سرسید نے دینداری اور مذہب کو جدید علوم اور جدید تہذیب سے ملا کر ایک نیا معاشرہ تعمیر کیا، وہ انتہائی مخلص انسان تھے، استقلالِ مزاج، صبر، بردباری، سنجیدہ شعور میں یکتائے روزگار تھے، انھوں نے مراسم کی زنجیریں توڑیں اور نئے تہذیب و تمدن مرتب کیے، جو آج بھی رائج ہیں"

سرسید ایک عظیم انسان تھے، ایسے انسان جن کا مثل صدیوں میں پیدا ہوتا تھا، انھوں نے قوم کو ایک نکر دی اور ایسی فکر جس نے مسلم قوم پر قبضہ کر لیا، اور بے شمار دانشوران کے گرد جمع ہو گئے" (ص ۵۶)

"سرسید نے قوم کو ہمت دلائی، کام کرنے کے لیے اکسایا، ناامیدی میں امید کا چراغ جلایا، ان سے کہا کہ اپنی خامیوں کا احساس کرو اور ان کو دور کرو کیونکہ خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنے اندر انقلاب پیدا نہ کرے، خود شناسی، خود اعتمادی اور قول و عمل میں راست بازی کی تعلیم دی اور اپنے صبر و استقامت سے قوم مسلم کے مردہ جسم میں تازہ خون دوڑا دیا۔" (ص ۵۷)

"سرسید کی عظیم شخصیت ایک انقلاب آفریں شخصیت تھی، انھوں نے کہا تھا کہ فلسفہ ہمارے داہنے ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس ہمارے بائیں ہاتھ میں اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کا تاج ہمارے سر پر، وہ انھوں نے کر دکھایا۔" (ص ۵۷)

دونوں قسم کے اقتباسات میں جو عظیم تضاد ہے اس کی تصریح کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن مصنف نے ایک ماہر وکیل اور صحافی کی حیثیت سے یہ جتانے کی کوشش کی ہے کہ علی گڑھ کالج اور علی گڑھ تحریک دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، اس کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ علی گڑھ کالج میں سرسید نے ہندو مسلم اتحاد، قومی یکجہتی اور سیکولرزم کوٹ کوٹ کر بھر دیا (ص ۶۷) اس لیے سرسید کو یہ خراج عقیدت پیش کرتے ہیں کہ جہاں تک ان کی تعلیمی خدمتوں کا معاملہ ہے وہ آسمانِ عظمت کے مہر و ماہ نظر آتے ہیں (ص ۵۸) اس رائے سے کس کو اختلاف ہو سکتا ہے، اسی کے ساتھ فاضل مصنف یہ بھی لکھتے ہیں کہ

کم و بیش نوّے سال سے زائد گذرنے کے بعد آج ہم سرسید کی تقریر پڑھتے ہیں تو جہاں تک سیاسی فکر کا سوال ہے ہمیں سرسید عظیم نظر نہیں معلوم ہوتے (ص ۵۹) اگر مصنف کی اس رائے سے اتفاق کر لیا جائے تو پھر ان کی اس رائے سے کیسے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ سرسید عالی دماغ انسان، عہد آفرین، روشن ضمیر دانا، یکتائے روزگار، ناامیدی میں امید کا چراغ جلانے والے، مسلمانوں کے مردہ جسم میں تازہ خون دوڑانے والے اور انقلاب آفرین تھے، اور اگر اس تضاد کو وکیلانہ انداز اور صحافت نگاری کی کھینچا تانی سے دور کر بھی لیا جائے تو پھر کیا مسلمان اور سرسید کی تحریک کے حامی ان کی اس رائے سے اتفاق کرنا پسند کریں گے کہ

"وہ یعنی سرسید چاہتے تھے کہ انگریز اسی طرح ملک پر حکمراں رہے اور مسلمان کسی قسم کی سیاست میں حصہ نہ لیں اور اسی کا نام علی گڑھ تحریک ہے۔" (ص ۶۱)

اس قسم کی باتیں مناظرانہ مباحث میں تو کہی جا سکتی ہیں، یا اخبار کے کالم نگار تو مزے لے لے کر لکھ سکتے ہیں، یا کسی سیاسی پلیٹ فارم پر کہہ کر تالیاں تو بجوائی جا سکتی ہیں لیکن باوقار تصنیف کے لیے باعث زیب و زینت نہیں ہو سکتی ہیں۔

فاضل مصنف ترکی کے سلطان عبدالحمید سے بھی خوش نہیں ہیں، وہ ان کو انگریزوں کا غلام، ترکی کا ایک ذرہ رہن کرنے والا، فوج میں عیسائیوں کو بھرنے والا، جدید طریقہ حرب کو نظر انداز کر کے ترکی عسکریت کا خاتمہ کرنے والا، درۂ دانیال کے قلعوں پر سے توپیں اور اسلحہ ہٹانے والا، ٹرانز جیندار، محبان وطن کا قاتل، روباہ صفت اور غدار وغیرہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں (ص ۱۸) مگر ان ہی کے فاضل ترین اور محبوب ترین معاصر مولانا ابوالحسن علی ندوی سلطان عبدالحمید ثانی کے متعلق یہ لکھتے ہیں:

"اس صدی کا آغاز ہوا تو سلطنت عثمانیہ اپنی پوری وسعت اور کرّوفر کے ساتھ موجود تھی، مسلمانوں کے سروں پر خلافت اسلامی کا علم سایہ فگن تھا، مسند خلافت پر سلطان عبدالحمید ثانی متمکن تھے جن کی ذات بیسویں صدی کے وسط تک سخت تنقید و اعتراض کا نشانہ بنی رہی، مغربی مصنفین نے تو اپنے قلم کی ساری سیاہی ان کے

چہرہ کو بدنما اور تاریک دکھانے میں صرف کر دی، لیکن پچھلے برسوں میں ان کے متعلق جو تحقیقی مضامین مؤقر عربی و ترکی رسائل میں شایع ہوئے ہیں نیز ان کے روزنامچے کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ وہ (اپنی بعض مزاجی خصوصیات اور کمزوریوں کے باوجود جو موروثی سلطنت کا بھی خاصہ ہو سکتی ہیں اور اندرونی و بیرونی مخالفتوں اور ان کے گرد پھیلی ہوئی سازشوں کا ردعمل بھی) ایک نہایت باحمیت اور صاحب غیرت مسلمان حکمراں تھے جن کے عہد میں مغربی طاقتیں ترکی کے حصے بخرے کر کے یہودی فلسطین کے کسی حصہ پر قابض ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے، اور انھوں نے ممتاز یہودی وفد کی ساری پیش کشوں اور رشوتوں کو حقارت سے ٹھکرا دیا تھا، اور زمین سے مٹی کی ایک مٹھی اٹھا کر کہا تھا کہ بیت المقدس تو بڑی چیز ہے، فلسطین کی سرزمین کی اتنی خاک بھی دینے کے لیے تیار نہیں اور جنھوں نے خلافت اسلامی کے پیکر میں ایک نئی روح اور عالم اسلام میں وحدت اسلامی اور جامعہ اسلامیہ کا ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا تھا (پندرہویں صدی ہجری ماضی و حال کے آئینہ میں) اگر فاضل مصنف زندہ ہوتے اور کہتے کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے اس بیان کو وہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ان سے یہی کہا جاتا کہ انھوں نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، اس کو رد کرنے کے حق سے دوسروں کو بھی محروم نہیں کر سکتے۔

مصنف مصطفیٰ کمال کے بڑے شیدائی نظر آتے ہیں، ان سے ان کو جو عقیدت ہے اس کا سیلاب ان کی تحریروں میں امنڈتا نظر آتا ہے، جس زمانہ میں مولانا محمد علی خلافت کا وفد لے کر لندن گئے تھے، وہاں مصطفیٰ کمال کی طرف سے بھی ایک وفد آیا ہوا تھا، اس وفد کی تعریف چاہے جتنی کی جاتی یہ لکھنے کی ضرورت نہ تھی:

"اس کا مقابلہ محمد علی کے وفد سے کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ایک غلام کی عرضداشت اور ایک جانباز مرد مجاہد کی للکار میں کتنا فرق ہوتا ہے۔" (ص ۲۱۵)

مولانا محمد علی نے لندن میں جو پرجوش اور ایمان پرور تقریریں کیں وہ ایک مرد مجاہد کی للکار سے کم نہ تھی، فاضل مصنف کو اپنے مرد مجاہد کا بھی معروضی مطالعہ اسی طرح کرنا چاہیے تھا جس طرح کہ انھوں نے ایک

غلام" کا کیا ہے" یہ غلام تحریک خلافت میں ناکام ہونے کے باوجود اپنی اسلام نوازی کے بے مثال درد دل کے ساتھ سپرد خاک ہوا، مگر مصنف کے مرد مجاہد نے زریں کارنامے انجام دیے، اپنی کامیابی پر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں گھوڑے پر سجدہ کرنے اور اپنی کامیابی میں اللہ تعالیٰ کی نصرت ساتھ رہنے کا اعتراف کرنے (ص ۷، ۳۱) کے باوجود ترکی سے اسلام کو خارج کرنے کا الزام بھی اپنے سر لیا، اور جب فاضل مصنف یہ لکھتے ہیں کہ

"وہی مصطفےٰ کمال جو مسلمانوں کا اب تک ہیرو تھا لعن طعن کا نشانہ بننے لگا، کچھ لوگ اس حد تک تجاوز کر گئے کہ اسے اسلام سے منحرف بلکہ اسلام کا دشمن قرار دینے لگے۔" (ص ۲۵۴)

تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مصطفےٰ کمال نے اسلام سے انحراف نہیں کیا، بلکہ ترکی سے اسلام کو خارج کرنے کے بعد بھی وہ اس کے مستحق تھے کہ ان کے لیے یہ راگ الاپا جائے کہ

ہمارا غازی کمال پاشا اپنا کمال دکھا رہا ہے۔

اس کتاب میں جس طرح سرسید کا معروضی مطالعہ کیا گیا ہے اسی طرح مصطفےٰ کمال نے اپنی فتحمندی اور کامرانی کے بعد اسلام کے ساتھ جو کچھ کیا اس پر بھی معروضیت کا اظہار ہونا چاہیے تھا، مگر جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کے مردہ جسم میں تازہ خون دوڑا دیا، یا جو اسلام کے نام پر مرا اس کے لیے تو تحریر غیر محتاط ہو گئی، مگر جو اسلام سے منحرف ہو گیا اس کی مداحی میں قلم سے جو تحریر نکلی وہ شاہکار بن کر نمودار ہوئی ہے، اور جب ہندوستان کے مسلمان خلافت کو برقرار رکھنے کے لیے جان کی بازی لگائے ہوئے تھے تو مصطفےٰ کمال نے اس کو ختم کر کے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا، معروضیت سے کام لے کر مصطفےٰ کمال پر غم و غصہ کا اظہار کرنے کے بجائے ڈاکٹر ٹے۔ کرہ جو مصنف 'کمالسٹ ٹرکی اینڈ دی مڈل ایسٹ' کے ایک بیان کا سہارا لیا گیا ہے، جس میں اس نے اور باتوں کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ مسئلۂ خلافت محض خیال رہ گیا تھا، اس کا کوئی ماننے والا باقی نہیں تھا، صرف وہی لوگ اس کو مانتے تھے جو اس سے

فائدہ اٹھا رہے تھے، اس لیے قدرۃً مصطفےٰ کمال نے سلطان اور خلافت کا خاتمہ کر دیا (ص ۲۵)

اور جب اکتوبر ۱۹۲۳ء میں مصطفےٰ کمال نے ترکی کے ایک جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا اور سلطان عبدالوحید تو وہاں سے ایک انگریزی جہاز پر بقول مصنف الٹا بھاگ گئے تو اس پر یہ شعر لکھ کر استہزاء کیا گیا ہے ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہ استہزاء اس کے متعلق ہے جس کے متعلق اس کتاب میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ مسلمان بجا طور پر سمجھتا تھا کہ یہ خلافت عثمانیہ کا جھلملاتا ہوا چراغ گل ہو گیا تو مسلمانوں کا کوئی وقار دنیا میں باقی نہیں رہے گا، اور مسلمان دنیا کے صحرائے ریگ زار میں ایک گم کردہ کارواں کی شکل اختیار کر لیں گے (ص ۲۲)

اس کتاب میں تحریک خلافت کے انعامات و تاثرات کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ اس کا سیر حاصل حصہ ہے، یہ ان لوگوں کے لیے قابل مطالعہ ہے جو بقول مصنف خوب بغلیں بجاتے اور مضحکہ اڑاتے تھے کہ آخر یہ سب کرنے سے کیا حاصل ہوا۔ (ص ۲۵۴)

کتاب پر یہ تبصرہ ذرا طویل ہو گیا ہے، جب یہ دارالمصنفین آئی تو اس کو پڑھ کر تکلیف ضرور ہوئی، یہاں کے لوگوں کے دلوں میں فاضل مصنف کی ذات کا جو احترام تھا اس بنا پر اس پر کچھ لکھنے سے احتراز کیا گیا، مگر مرادآباد سے ایک دیندار بزرگ نے لکھا کہ معارف میں اس پر تبصرہ شایع نہیں ہوا، تو قیامت کے روز اس کا مواخذہ کیا جائے گا، اسی کے بعد یہ تبصرہ بادل ناخواستہ قلمبند کیا گیا ہے۔

مطبوعات جدیدہ

فہرست نسخہ ہائے خطی کتابخانہ گنج بخش جلد اول و دوم مرتبہ، جناب احمد منزوی صاحب تقطیع کلاں، کاغذ بہتر، طباعت ٹائپ، مجموعی صفحات ۸۰۰، مجلد قیمت درج نہیں،

پتہ :- مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد،

فارسی زبان و ادب کی خدمت اور اس سے متعلق علوم کی اشاعت کی غرض سے اسلام آباد میں مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان کا قیام عمل میں آیا ہے، اس کی شایع کردہ "کتاب خانہ ہائے پاکستان" کا چند ماہ قبل ان صفحات میں ذکر آچکا ہے، یہ کتاب بھی اسی مرکز نے شائع کی ہے، اس میں کتاب خانہ گنج بخش کے مخطوطات کی فہرست مع تعارف درج ہے یہ کتب خانہ مشہور بزرگ حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویری معروف بہ داتا گنج بخش (م ۴۶۵ھ ۱۰۷۳ء) صاحب کشف المحجوب کے نام نامی پر قائم کیا گیا ہے فہرست کی پہلی جلد دس اور دوسری چھ حصوں پر مشتمل ہے، دونوں جلدوں میں حسب ذیل فنون کی کتابوں کا ذکر ہے، تفسیر، تجوید، علوم قرآن ریاضی، موسیقی، نجوم طبیعیات، کیمیا، طب، علوم تجربی، منطق، فلسفہ، فرق، مذاہب، کلام و عقائد، تصوف اور فلسفۂ عملی، پہلی جلد میں تین اور دوسری میں ایک مفصل فہرست دی گئی ہے، ان فہرستوں میں ہر مصنف کے نام کے تحت ان کی ان تمام کتابوں کے نام تحریر کئے گئے ہیں جن کا کتاب میں کہیں ذکر ہوا ہے، تعارف میں مخطوطات کے موضوع، ابواب اور ان کے مباحث کا خلاصہ اختصار کے ساتھ درج ہے، اور جن کے مصنفین کے نام کا پتہ چل سکا ہے، ان کا نام ذکر کرکے ان کے متعلق مختصر معلومات بھی پیش کئے گئے ہیں، ان دونوں جلدوں میں مختلف فنون کے ۶۷ ۱۲ فارسی مخطوطات کا ذکر ہے، اس فہرست کی اشاعت پر مرتب اور ناشر دونوں تحسین کے مستحق ہیں،

جلد ۱۲۸ ماہ ذوالحجہ ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۸۱ء عدد ۴

مضامین